ہفت روزہ
الفتح
کراچی

گرفتاریاں ہی گرفتاریاں





۱۷-۲۴ اگست ۱۹۷۲ء

قیمت ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے ۷۵ پیسے

توحید

کس طرح اربابِ جرأت مند ـــ باو آزِ دف
اُڑ رہے ہیں بے تکلف ـــ چاند تاروں کی طرف
خُود بخود اسرارِ فطرت ـــ تل رہے ہیں ذہن پر
رازِ سربستہ ادب سے ـــ کُھل رہے ہیں ذہن پر
اُڑ گیا بن کر دھواں ـــ اندھے یقینوں کا طلسم
گر چکا ہے ٹوٹ کر ـــ مذہب کے تخمینوں کا جسم
اب کرشمہ دیر تک ـــ مستور رہ سکتا نہیں
ہے خدا تو آدمی سے ـــ دُور رہ سکتا نہیں

زہروں کے امتحان

موت کتنی خوش نما مرتا ہے ـــ اِک اُمیدوار
خوبصورت وعدہ و پیمان کا ـــ کاٹا ہوا !
برق چھو جانے سے بھی آتی ہے ـــ مرگِ ناگہاں !
لیکن اُف اِک باؤلے حیوان کا ـــ کاٹا ہوا !
عقل والوں کی عداوت اتنی ـــ جاں لیوا نہیں
جتنا ہمدردی سے ـــ اِس نادان کا کاٹا ہوا
میرا عرفانِ حقیقت کیا کرے گا ـــ اُس جگہ
جس جگہ سب شہر ہو ـــ رُومان کا کاٹا ہوا
رات دن لاحول پڑھتا ہے ـــ جو شیخِ محترم
ہے یقیناً ـــ خلد کے دربان کا کاٹا ہوا
سانپ کا کاٹا ہُوا تو ـــ بچ بھی جاتا ہے عدم
بچ نہیں سکتا کبھی ـــ اِنسان کا کاٹا ہوا



سیّد عبدالحمید عدم

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد- ۳ شمارہ : ۱۴

۱۷-۲۴ اگست ۱۹۷۲ء

نگران
شوکت صدیقی

مدیر
ارشاد راؤ

نائب مدیر
وہاب صدیقی

سرورق : اقبال عشرتی

	فی پرچہ	سالانہ	سہ ماہی
بدلِ اشتراک:	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے:	۵۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت: ۶۰ فلس۔ دوبئی، قطر: ۵،۰ درم
سعودی عرب: ۱۵ قرش۔ انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقام اشاعت
ہفت روزہ "الفتح" ۲۰۰-۷، ڈی نرسری کمرشل ایریا
پی ای سی ایچ ایس - کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر: ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد - کراچی

ٹیلیفون : ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

۱۴ اگست

آج ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے مناظر پر نظر ڈالتے تو محسوس ہو گا کہ ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء بھی تو وہی سماں پیش کر رہا ہے۔ ایک منظر ۲۵ سال پہلے کا ہے، جس میں پاکستان کی مخالف اور حامی طاقتوں میں زبردست تصادم دکھائی دیتا ہے۔ قیام پاکستان کے حامی اپنے وطن کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے خون کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ اس عالم میں درندہ صفت مخالفین پاکستان کے حامیوں کی عزت و آبرو سے کھیلنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ لاشوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ مائیں، وطن کے لئے بیٹوں کو شہید ہوتے دیکھتی ہیں۔ ان کے سر فخر سے بلند ہو جاتے ہیں۔

اس وطن کے لئے خون دینے والوں کی کمی نہیں۔ کروڑوں سر حاضر ہیں۔ کروڑوں مائیں کروڑوں بیٹوں کے سر پیش کرنے کے لئے بیقرار ہیں۔ سہاگنیں اپنی مانگ کا سندور وطن کی سرزمین پر نچھاور کر رہی ہیں۔ چوڑیاں ٹوٹ رہی ہیں۔ بہن بھائیوں کو اپنی آبرو کا واسطہ دیتی ہیں کہ وہ وطن کی راہ میں قربانیاں دینے سے گریز نہ کریں۔

یہ ۱۹۴۷ء ہے۔ آج ۱۹۷۲ء ہے۔ آج بھی تو یہی ہو رہا ہے۔ قیام پاکستان کی جدوجہد میں جو ہوا ہے، آج اس سے مختلف سماں نہیں۔ نئی نسل نے پاکستان کی جدوجہد کو نہیں دیکھا، وہ بقائے پاکستان کی جدوجہد کو دیکھ لے، ذرہ برابر بھی تو کوئی فرق نہیں۔

پاکستانی اپنی آزادی کے دفاع کی جنگ ۲۵ سال سے لڑ رہے ہیں۔ پاکستان کے مخالفین پاکستان میں پہلے سے موجود ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑی مخالف پارٹی جماعت اسلامی پاکستان کی زبردست حامی بن گئی ہے۔ کٹر احراری شورش اس کا بغل بچہ بن چکا ہے۔ یہ لوگ پاکستان کو بچانے کے بھیس میں جو کر رہے ہیں، وہ بعینہٖ وہی ہے جو انہوں نے قیام پاکستان کے وقت کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے مخالفین نے اس سرزمین کا چاروں طرف سے محاصرہ

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



سرورق کی کہانی

یہ گرفتاریاں سیاسی عمل کے منافی ہیں

الفتح رپورٹ

صوبۂ سندھ میں خونی ہنگاموں کے بعد صوبائی حکومت نے وسیع پیمانے پر گرفتاریاں کی ہیں اور یہ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔

گرفتار ہونے والوں میں جی ایم سید اور نواب مظفر حسین کے نام سرِفہرست ہیں۔ عوام ان رہنماؤں کی غلط تحریکوں، ناقص حکمتِ عملی اور کسی حد تک عوام دشمن پالیسیوں کی وجہ سے تنگ آچکے تھے۔ ایک طرف سندھی اور دوسری طرف اردو کے نام پر مزدوروں، کسانوں، طلبہ اور مظلوم عوام کی طبقاتی جدوجہد کو ختم کرنے کے لئے علاقائی عصبیت اور لسانی تنازعات کو ہوا دی جارہی تھی۔ اس عمل میں حکمران جماعت کے بعض افراد بھی شامل تھے۔ یہ سب مل کر پنجابی مزدور کو سندھی مزدور، مہاجر ہاری کو سندھی ہاری اور اس طرح مظلوم قومیتوں کو ایک دوسرے سے لڑوانے کا عمل تیز کرنے میں مصروف تھے۔

حکومت نے اس بات کو بھانپ لیا کہ کسان اور مزدور اس کی لپیٹ میں نہیں آرہے بلکہ عوام میں ان کے خلاف بددلی اور بے چینی پھیل رہی ہے۔ جگہ جگہ پر، محلوں اور گلیوں میں ایسی کمیٹیاں تشکیل دی جارہی تھیں جو ہنگامہ کرنے والوں کے خلاف کارروائی کرنے کی مجاز تھیں۔ حکومت نے اس فضا کو محسوس کیا اور حیدرآباد اور دوسرے مقامات پر جی۔ ایم سید اور نواب مظفر حسین کی تقریروں کے خلاف عوام کے شدید ردِعمل کے نتیجے میں بالآخر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

ان گرفتاریوں پر عوام اطمینان کا اظہار کررہے ہیں۔ ہر چند کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتاریاں سیاسی عمل کے منافی ہیں لیکن پیپلز پارٹی اس عمل سے گریز کا راستہ اختیار کررہی ہے تو اس کے علاوہ چارہ کار کوئی نہیں کہ ملک کو خانہ جنگی سے بچایا جاسکے۔ یہ کارروائی دیرپا ثابت نہیں ہوگی۔ جمہوریت میں عوام کے بل بوتے پر اقتدار حاصل کرنے والی سیاسی جماعت کو عوام دشمنوں کی کارروائیوں کا جواب سیاسی محاذ سے دینا چاہیئے۔ پولیس سیاسی مسائل کا حل نہیں بلکہ اس نے ایسے کاموں کے دوران الجھنیں پیدا کی ہیں۔ نوکر شاہی کی حکمتِ عملی پر کام کیا ہے اور اس کے نتائج بہت برے نکلے ہیں۔

حال میں جو گرفتاریاں ہوئی ہیں، ان میں مقامی پولیس نے کورنگی سے ایک معذور طالب علم آغا علی رضوی کو گرفتار کیا ہے۔ ان کی دونوں ٹانگیں غائب ہیں۔ وہ پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر حرکت کر سکتے ہیں۔ پولیس نے ہنگاموں کے دوران اس نوجوان کو ڈکیتی، بلوے اور لوٹ مار کے الزامات کے تحت گرفتار کیا تھا۔ اب پھر یہی نوجوان پولیس کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔

کورنگی سے ہی جناب ابرار الحسن کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ یہ پیپلز پارٹی کے این۔ ڈی۔ خان کے حریف ہیں اور معراج محمد خان نے انہیں لانڈھی کورنگی کا چیئرمین نامزد کیا تھا۔ این۔ ڈی۔ خان صاحب کا مخالف ہونا ہی ان کی گرفتاری کا باعث بن گیا۔ شبر اعظمی کے وارنٹ گرفتاری بھی اسی مخالفت کا نتیجہ ہیں اور ڈاکٹر رشید حسن خان کی تلاش بھی اسی جذبے کی عکاسی کرتی ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ پیپلز پارٹی کے حکمران انتہائی غلط حکمتِ عملی کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ عوام پر یہ ثابت کررہے ہیں کہ وہ عوام دشمنوں کو پکڑ رہے ہیں اور اندرونِ خانہ ان لوگوں کو بھی معاف نہیں کیا جارہا جو ان کے ساتھ رہتے ہوئے ان سے اختلاف کرنے کی جرأت کررہے ہیں۔

ہم اس معاملے کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتے کہ اس سے رجعت پسندوں کو فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔ اسے حکمران جماعت وقتی طور پر کمزوری تصور کرسکتی ہے لیکن یہ عمل اس کے اپنے مفاد میں نہیں۔ صدر بھٹو اس معاملے میں فوری مداخلت کریں اور گروپوں کی بنیاد پر گرفتاریاں منسوخ کرنے کے احکامات صادر فرمادیں۔

یہ کتنی افسوسناک بات ہے کہ ایک صوبائی وزیر تھانے میں ایسے افراد سے ملاقات کے لئے گئے جنہیں گروپ کی بنیاد پر حوالات میں بند کردیا گیا۔ تو پولیس نے اس وزیر کے ساتھ ناروا سلوک سے کام لیا اور انتہائی توہین آمیز رویہ برتا۔

"دارالاسلام" کا منصوبہ لندن میں تیار کیا گیا

ابوالمنصور

"دارالاسلام" کے نام سے علیحدہ صوبے کے قیام کا اعلان ۱۴ اگست کو ہونے والا تھا۔ مگر سندھ میں وسیع پیمانے پر گرفتاریوں نے اس منصوبے کو بڑی حد تک ناکام بنادیا۔ یہ منصوبہ بنیادی طور پر نیا منصوبہ نہیں ہے۔ یہ اُسی سازش کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے تحت اُردو کے نام پر پورے سندھ میں ہنگامے ہوئے اور مہاجرین اور سندھیوں کے درمیان فتنہ و فساد کی آگ بھڑکی۔

اس خفیہ منصوبہ کا انکشاف اس طرح ہوا کہ جولائی کے آخری ہفتے میں جانچ پڑتال کے دوران کسٹم حکام کے ہاتھ بعض ایسے پیکٹ آئے جو خلیج فارس کی ریاست قطر سے بھیجے گئے تھے۔ ان پیکٹوں کو کھولا گیا تو اندر سے ایسے پمفلٹ برآمد ہوئے جن میں دارالاسلام کا منصوبہ تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔

یہ پمفلٹ نہایت عمدہ کاغذ پر اُردو میں چھپے ہیں۔ کتابت و طباعت خوب صورت اور دیدہ زیب ہے۔ اس میں ایک نقشہ بھی درج ہے، جس میں حیدرآباد، کوٹری، ٹھٹھہ اور کراچی پر مشتمل ایک ایسے علاقے کی نشان دہی کی گئی ہے، جہاں اُردو بولنے والے مہاجرین اکثریت کے ساتھ آباد ہیں۔ پمفلٹ میں جو اعداد و شمار درج ہیں ان کے مطابق اس علاقے میں ۶۲ فی صد مہاجر آبادی ہے۔

"دارالاسلام" کے منصوبے کے متعلق ان پمفلٹوں کی آمد سے کچھ ہی عرصہ پہلے بیرونِ ملک سے آنے والے ایسے پمفلٹ بھی پکڑے گئے جو سندھی اور انگریزی زبان میں چھپے تھے۔ ان میں "سندھو دیش" کا منصوبہ درج تھا۔ ان کے لئے بھی اعلیٰ درجے کا کاغذ استعمال کیا گیا تھا۔ طباعت بھی نہایت معیاری تھی۔ گو کہ ان پر کسی چھاپہ خانے اور ناشر کا نام درج نہیں۔ مگر انہیں دیکھ کر آسانی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ "دارالاسلام" اور "سندھو دیش" کے بارے میں دونوں قسم کے پمفلٹ ایک ہی پریس سے شائع ہوئے ہیں۔

یہ پمفلٹ کس ملک سے شائع ہوئے ہیں اور ان کو شائع کرنے والے کون ہیں؟ اس سلسلے میں ابھی تک دو اندازے لگائے جا رہے ہیں۔ پہلا اندازہ یہ ہے کہ یہ پمفلٹ بھارت میں چھاپے گئے اور قطر کے علاوہ دوسرے ممالک کے ذریعے پاکستان میں پہنچائے گئے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ان کی اشاعت لندن میں ہوئی ہے اور یہ منصوبہ بھی لندن میں بیٹھ کر بعض پاکستانی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے سیاسی ٹولے نے تیار کیا ہے۔ لیکن اس بات پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ انہیں شائع کرکے پاکستان میں تقسیم کرنے والا ایک ہی سیاسی گروہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ پچھلے دو ماہ سے اس گروہ نے اپنی سیاسی سرگرمیاں بہت تیز کردی ہیں۔

یہ پمفلٹ جن لوگوں کے نام پاکستان بھیجے گئے۔ بظاہر وہ غیر سیاسی اور کاروباری قسم کے لوگ ہیں۔ مگر پوچھ گچھ اور تفتیش کے دوران یہ راز کھلا کہ یہ لوگ محض ایجنٹوں کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کا کام نیپ اور دائیں بازو کے بعض رہنماؤں تک انہیں حفاظت کے ساتھ پہنچانا تھا۔ ان کا کام ان کی تقسیم سے نہ تھا۔ وہ انہیں مخصوص افراد کے حوالے کردیتے اور معقول معاوضہ وصول کرتے۔

ان پمفلٹوں کے بارے میں انتظامیہ کی تحقیقات ہنوز جاری تھی کہ حیدرآباد میں بعض ایسے افراد دیکھے گئے جو "دارالاسلام" کے پمفلٹ تقسیم کرتے تھے۔ پمفلٹ کے ساتھ ایک عہد نامہ ہوتا جس میں اسلام اور سرفرازی کے لئے خدا اور اس کے رسُول کو گواہ بنا کر یہ عہد کرایا جاتا کہ "دارالاسلام" کے قیام کیلئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائیگا۔

یہ عہد نامے صرف اُردو بولنے والے مہاجرین سے لئے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے بعض جوشیلے نوجوانوں نے عہد نامے اپنے خون سے بھی بھرے ہیں۔ جو لوگ یہ عہد نامے بھروا رہے ہیں اُن کا تعلق نیپ اور جمعیت العلمائے پاکستان کے علاوہ مہاجرین کی سیاسی اور نیم سیاسی تنظیموں سے ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی اس مہم میں زیادہ سرگرمی کا اظہار نہیں کررہی ہے۔ اس کے کارکنوں نے نہ تو اب تک "دارالاسلام" کے پمفلٹ تقسیم کئے اور نہ کسی سے عہد نامے پر دستخط کروائے۔

"دارالاسلام" کی مہم میں جماعت اسلامی کی عدم دلچسپی کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ شروع میں وہ اس تحریک میں پوری طرح شریک تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ قیادت اُس کے ہاتھ رہے۔ مگر پچھلے دنوں طے شدہ منصوبوں کے تحت جتنے بھی ہنگامے کرائے گئے۔ ان میں نیپ کا جھکاؤ جمعیت العلمائے پاکستان اور اس کی ہمنوا دوسری اسلام پسند جماعتوں اور شخصیتوں کی جانب رہا۔ ہر موقع پر نہ صرف جماعت کو نظر انداز کیا گیا بلکہ بعض خفیہ جلسوں میں نیپ کے رہنما محمود الحق عثمانی نے یہ کوشش کی کہ جماعت اسلامی کو شامل نہ کیا جائے۔

جماعت اسلامی نے سندھ کے سیاسی محاذ پر عبدالغفور کو اپنا کمانڈر مقرر کیا تھا۔ مگر راولپنڈی میں لسانی مسئلہ پر مذاکرات کے دوران نیپ کے نمائندوں نے عبدالغفور کے مقابلے میں جمعیت کے شاہ فرید الحق کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ بلکہ ان مذاکرات کے موقع پر کئی بار ایسا ہوا کہ نیپ اور جمعیت نے عبدالغفور کے ساتھ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو بھی کاٹنے کی کوشش کی۔ اس لئے کہ اشتیاق حسین قریشی بھی دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں جماعت اسلامی سے نہ صرف قریب ترین بلکہ ہر معاملے میں اس سے مشورہ کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

جماعت کا ایک ایکسٹرا اعتراض نیپ کے ہمنوا "دانش وروں" کے بارے میں بھی تھا۔ جو ہر خفیہ جلسے میں شریک ہوتے اور خود کو اس طرح پیش کرتے گویا اُردو کے جملہ حقوق صرف انہی کو حاصل ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ بعض افراد کی خواہش اور اصرار کے باوجود دونوں دانش وروں کی مخالفت کے باعث پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ایسے ہی دوسرے غیر سیاسی اہل قلم کو ان جلسوں میں شریک نہیں کیا گیا۔ جماعت اسلامی دونوں "دانشوروں" کو شروع ہی سے شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتی تھی بلکہ اس کے نمائندوں نے اکثر ان کے بارے میں اس بداعتمادی کا اظہار بھی کیا کہ ان کا پورا ماضی موقع پرستی کی ایک طویل داستان ہے۔ یہ مخالفت کے نام پر حکومت سے اپنی زیادہ سے زیادہ قیمت مقرر کروانا چاہتے ہیں۔

جماعت اسلامی نے گرفتاریوں سے بچنے کیلئے حکومت کو سازش سے باخبر کر دیا

یہ اور ایسے ہی دوسرے اسباب تھے، جن کے باعث بعض خفیہ جلسوں میں جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کے درمیان تلخی پیدا ہوتی اور پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ جماعت نے ان سرگرمیوں میں عدم دل چسپی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس سیاسی مہم میں نہ صرف یہ کہ قیادت اس کے ہاتھ میں نہ رہے گی بلکہ ہو سکتا ہے کہ سرے سے اسے کاٹ ہی دیا جائے۔ چنانچہ جب یہ اطلاعات پہنچیں کہ حکومت عنقریب سخت کارروائی کرنے والی ہے اور پکڑ دھکڑ شروع ہونے والی ہے تو اس نے خود کو اور بھی زیادہ علیحدہ کر لیا۔

بتایا جاتا ہے کہ ان خفیہ سیاسی سرگرمیوں کی تمام تفصیلات جماعت اسلامی نے حکومت تک پہنچا دی ہیں۔ بعض اطلاعات کے مطابق جماعت اسلامی نے حکومت کو یہ بھی یقین دلایا ہے کہ "دارالاسلام" کے منصوبے میں وہ کوئی دل چسپی نہیں رکھتی اور نہ آئندہ اس میں شریک ہونے کا کوئی ارادہ رکھتی ہے۔

جماعتِ اسلامی کے رویّے میں یہ بڑی تبدیلی کیوں پیدا ہوئی؟ اس کے دو بنیادی اسباب بتائے جاتے ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے سندھی کارکنوں اور رہنماؤں نے مودودی پر یہ دباؤ ڈالا کہ اردو اور مہاجرین کے مسئلہ پر جماعت نے جو مؤقف اختیار کیا ہے اس نے سندھ میں نہ صرف جماعت کا بیڑا غرق کر دیا بلکہ خود ان کی جان و مال کو شدید خطرہ لاحق ہے ابتدا میں سندھی رہنماؤں کے اس احتجاج پر جماعت میں توجہ نہ دی اور مہاجرین کی قیادت حاصل کرنے کی کوشش میں بہت آگے نکل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ میں جماعتِ اسلامی مہاجر اور سندھی دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی کشیدگی روز بروز بڑھتی گئی۔ جماعت کے سندھی ارکان اور متفق تیزی سے علیحدگی اختیار کرنے لگے اور یہ خیال شدت اختیار کرنے لگا کہ سندھ میں جماعتِ اسلامی صرف مہاجرین تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔

جماعتِ اسلامی کے رویّہ میں تبدیلی کا دوسرا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ حکومتِ سندھ کے اندر خصوصیت کے ساتھ سی آئی ڈی کے محکمہ میں جماعتِ اسلامی کے جو کارکن اور ہمدرد موجود ہیں انہوں نے جماعت کو باخبر کر دیا کہ نیپ اور جمیعت العلمائے پاکستان، دائیں بازو کی دوسری جماعتوں کے اشتراک سے جماعت کو اپنی مہم سے الگ تھلگ کرنے کی سازش میں مصروف ہیں۔ علاوہ ازیں حکومت وسیع پیمانے پر گرفتاریاں کرنے والی ہے۔

جماعتِ اسلامی نے حالات کا یہ رُخ دیکھا تو فوراً پینترا بدلا۔ حکومت کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ گرفتاریوں کی زد میں نہ آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جماعت کے علاوہ دوسری تمام سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے رہنما اور کارکن پکڑے گئے، ان کے گھروں پر چھاپے پڑے، خانہ تلاشی ہوئی، جماعتِ اسلامی صاف بچ گئی۔

اس سلسلے میں ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن (رشید حسن گروپ) کے کارکن جماعتِ اسلامی کے اشارے پر گرفتار کیے گئے، زیادہ سے زیادہ وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے، گھروں پر چھاپے مارے گئے، عزیزوں اور رشتہ داروں کو خوفزدہ کیا گیا۔ حالانکہ وہ اس تمام سیاسی مہم میں نہ صرف یہ کہ شریک ہی نہ تھے بلکہ اس سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے، کھلم کھلا اس کی مخالفت کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ جماعت نے اپنے ایسے کارکنوں کے ذریعے جو کراچی پولیس اور انتظامیہ کے اہم عہدوں پر فائض ہیں، حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ سندھ میں وسیع پیمانے پر گرفتاریوں سے جو سیاسی خلا پیدا ہوگا اس سے بائیں بازو کے عناصر خصوصیت کے ساتھ این۔ ایس۔ ایف کا رشید حسن گروپ اور مزدوروں کی بعض ٹریڈ یونینیں فائدہ اٹھا کر صوبے میں انتشار اور لاقانونیت پھیلانے کی کوشش کریں گی لہٰذا اس امکان کا فوری سدِّ باب ضروری ہے۔

غرضیکہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ "سندھو دیش" کی طرح "دارالاسلام" کی سیاسی مہم بھی ایک منظم غیر ملکی سازش ہے جس کے لیے پورے سندھ میں بہت بڑی تعداد میں روپیہ اور اسلحہ تقسیم کیا گیا۔ بعض سیاسی سماجی اور طلبا کی تنظیموں کے ارکان خریدے گئے، انہیں منہ مانگی قیمت دی گئی۔ بھاگ دوڑ کے لیے اسکوٹر خرید کر دیئے گئے۔ گرفتاری کی صورت میں الاؤنس کے علاوہ قانونی چارہ جوئی مہیا کرنے کی ضمانت دی گئی۔

یہ تمام باتیں حکومت کے علم میں ہیں اور ان ہی کی روشنی میں وسیع پیمانے پر گرفتاریاں کی گئیں جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے گرفتاریوں کے سلسلے میں حکومتِ سندھ جو وائٹ پیپر شائع کر رہی ہے۔ توقع ہے کہ اس میں ان حقائق پر سے بھی پردہ اٹھایا جائے گا۔ اگر بعض ایسے بیرونی ممالک کا دباؤ مزاحم نہ ہوا جو کسی نہ کسی طور سے اس سازش میں ملوث ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ایسے انکشافات بھی عوام کے سامنے آئیں کہ بعض سیاسی جماعتوں اور شخصیتوں کی اردو نوازی اور مہاجر دوستی کا بھرم کھل جائے اور عوام پر حقیقتِ حال پوری طرح واضح ہو جائے۔

الفتح انکشاف

- لندن میں شیخ مجیب اور پاکستانی سرمایہ داروں کے درمیان خفیہ مذاکرات
- کیا سرمایہ دار ملک چھوڑ کر بھاگنے والے ہیں؟

ولیکا کھٹمنڈو اور آدم جی سنگاپور میں سرمایہ کاری کر رہے ہیں

داؤد، ولیکا اور جنرل حبیب اللہ کی پُر اسرار رہائی، غیر ممالک میں جمع زرمبادلہ منگوانے کی آخری تاریخ گذر جانے کے بعد حکومت کی پُر اسرار خاموشی، عوام کے ذہنوں میں کئی سوال پیدا کر دیتے ہیں۔ عوام تفصیلات جاننا چاہتے ہیں لیکن سرکاری اور سرمایہ داروں کے اخبارات خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں۔ "الفتح" پہلی مرتبہ اس راز سے پردہ اٹھا رہا ہے۔

صنعت کاروں اور گماشتہ سرمایہ داروں پر دباؤ ڈالنے کے لئے حکومت نے داؤد، ولیکا اور جنرل حبیب اللہ کو گرفتار کیا۔ ان کی گرفتاری نے سرمایہ داروں میں کھلبلی مچادی۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھے۔ داؤد، ولیکا اور جنرل حبیب اللہ کی رہائی کے لئے منصوبے مرتب کئے۔ منصوبے کے مطابق سرمایہ دار ارباب اقتدار سے ملے۔ اور پیش کش کی کہ حکومت کو جتنے زرمبادلہ کی ضرورت ہے۔ وہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ یہ تجویز پیش کی گئی کہ حکومت داؤد، ولیکا اور جنرل حبیب اللہ کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے۔ جتنی مالیت کا زرمبادلہ درکار ہے۔ اس کی مالیت بتائے۔ حکومت کے اعلان کے مطابق سرمایہ دار اپنے زرمبادلہ کی مالیت بتائیں گے۔ اگر سرمایہ داروں کا ظاہر کردہ زرمبادلہ مطلوب زرمبادلہ سے کم ہوا تو صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی انجمن اس کمی کو پورا کردے گی۔

حکومت نے یہ تجاویز تسلیم کرلیں۔ داؤد، ولیکا اور جنرل حبیب اللہ کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ سرمایہ داروں نے چار کروڑ روپے کی مالیت کا زرمبادلہ ظاہر کیا۔ جب کہ امریکی ہفت روزے "نیوز ویک" نے غیر ممالک میں جمع سرمایہ داروں کے زرمبادلہ کی مالیت ۵۰ کروڑ ڈالر بتائی تھی۔ سرمایہ داروں کا ظاہر کردہ زرمبادلہ حکومت کی ضرورت سے بہت کم تھا۔ حکومت نے اس کمی کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا لیکن صنعت کاروں اور سرمایہ داروں نے انکار کر دیا۔ اور یہ موقف اختیار کیا کہ حکومت پہلے صنعتی امن اور معاشی استحکام بحال کرے۔ اس کے بعد ہی حکومت کے مطالبہ پر غور کیا جا سکتا ہے۔

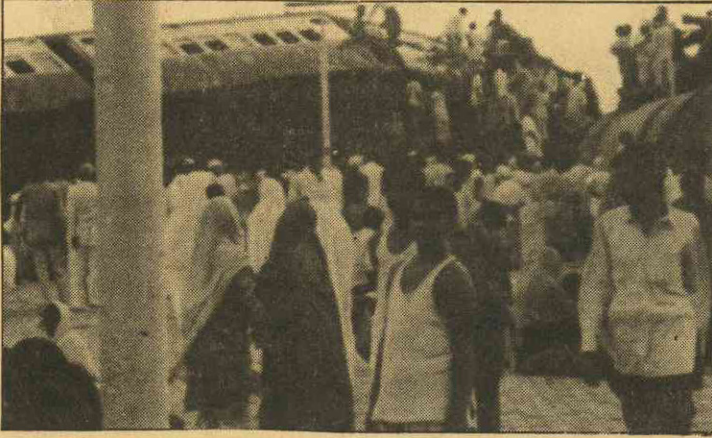
پھر حکومت نے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں پر دباؤ ڈالنے کے لئے نیم دلانہ اقدامات کئے۔ چند صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لیا گیا۔ مینجنگ ایجنسیاں توڑ دی گئیں۔۔۔۔ لیکن ان کے حصص برقرار رکھے گئے۔ حکومت کا یہ اقدام نہ تو انقلابی تھا اور نہ سوشلسٹ معیشت کی طرف کوئی قدم، بھارت میں ۱۹۵۳ء میں مینجنگ ایجنسیاں ختم کر دی گئی تھیں لیکن پاکستان میں شریف الدین پیرزادہ کی رپورٹ پر مینجنگ ایجنسیاں برقرار رکھی گئیں۔ اگر یہ اقدام ۱۹۵۳ء میں ہی کر لیا جاتا۔ تو ملک معاشی بحران میں مبتلا نہیں ہوتا۔ جب حکومت نے چند صنعتوں کو سرکاری تحویل میں لیا۔ تو صنعت کاروں کو خدشہ پیدا ہوا کہ مبادا تمام انڈسٹری سرکاری تحویل میں نہ لے لی جائے۔ اس خدشہ کے پیش نظر انہوں نے غیر ممالک میں انڈسٹری لگانی شروع کر دی۔ معلوم ہوا ہے کہ ولیکا نے

کھٹمنڈو (نیپال) میں ٹیکسٹائل کا ایک مل لگایا ہے۔ آدم جی سنگاپور میں صنعت کاری کر رہا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ غیر ممالک میں پاکستانی صنعت کار جو کارخانے لگا رہے ہیں ان کی مشینری پاکستان ہی سے گئی ہے۔ حکومت کے پاس درآمد شدہ مشینری کے اعداد و شمار موجود ہیں۔ اسے چاہیئے کہ وہ تمام ملوں کا سروے کرے۔ کہ جو مشینری درآمد کی گئی تھی وہ ملوں یا کارخانوں میں موجود ہے یا نہیں۔

جب بجٹ آیا تو پاکستان پیپلز پارٹی اور سرمایہ داروں میں ٹھن گئی کیونکہ بجٹ میں صنعت پر ٹیکس لگایا گیا زراعت پر نہیں لگایا گیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ موجودہ حکومت جاگیرداروں اور وڈیروں کی محافظ ہے۔ ان کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ چنانچہ حکومت اور سرمایہ داروں میں کشمکش تیز ہو گئی۔ سرمایہ داروں نے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لئے صنعت کا پہیہ جام کر دیا۔ ملوں میں تالہ بندی کر دی۔ خام مال خرید نا بند کر دیا۔ اور پیداوار میں کمی کر دی۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ۲۲ خاندانوں کا کوئی نہ کوئی مرد غیر ملک میں مقیم ہے۔ ولیکا، نیپال میں اور آدم جی سنگاپور میں صنعت کاری کر رہے ہیں۔ سیٹھ احمد داؤد کا بیٹا اور داؤد ہرکولیس کا سابق مینجنگ ڈائریکٹر عزیز داؤد لندن میں ہے۔ جنرل حبیب اللہ اور اے۔ کے۔ سومار لندن میں بڑی شان و شوکت سے رہ رہے ہیں بنگلہ ہے، لمبی سی شوفر ڈرائیوان کار ہے۔ حالانکہ برطانیہ ایسے ملک میں برطانوی لارڈز بھی شوفر کی "عیاشی" نہیں کر سکتے۔ برطانوی وزیراعظم اقتدار سے محروم ہونے کے بعد اگلے روز ہی خود کار چلاتا نظر آیا۔ بتایا جاتا ہے کہ لندن میں مقیم یہ پاکستانی صنعت کار بنگلہ دیش کے وزیراعظم سے کچھ معاملات طے کرنا چاہتے ہیں تاکہ بنگلہ دیش میں وہ صنعت کاری کر سکیں یا پھر اسے اپنی منڈی کے طور پر استعمال کریں۔ باوانی خاندان نے تہران میں اپنا دفتر قائم کیا ہے۔ پاکستان انٹرنیشنل ائیر کے سابق مینجنگ ڈائرکٹر نے امریکی شہریت اختیار کر لی ہے۔ وہ آج کل نیویارک میں مقیم ہیں۔

اب ان کا انتظار فضول ہے





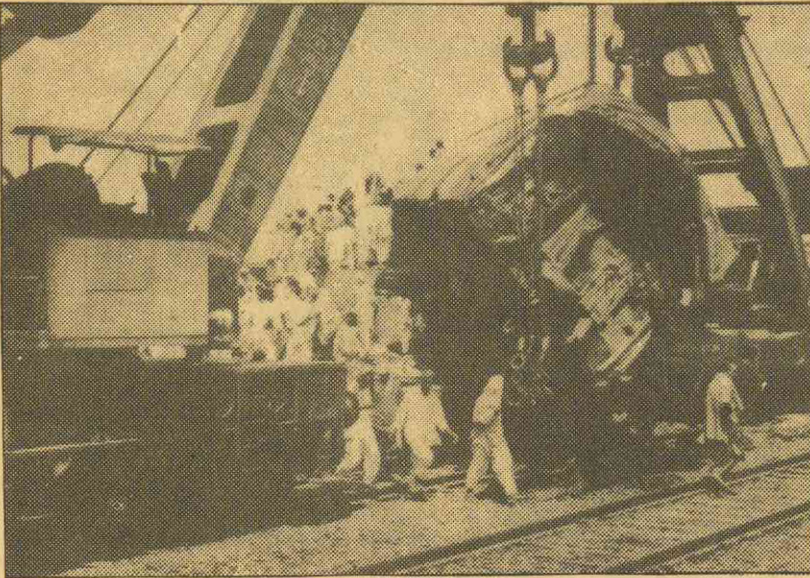


لاشوں کا معاوضہ کب تک؟

۲۰ اگست کو پشاور سے کراچی آنے والی تیز رو بہاول پور سے ۶۸ میل دور لیاقت پور ریلوے اسٹیشن پر کھڑی ہوئی ایک مال گاڑی سے ٹکرا گئی۔ تیز رو کی انجن سمیت چار بوگیاں اور مال گاڑی کی چار بوگیاں مکمل طور پر تباہ ہو گئیں۔ سینکڑوں افراد جس میں مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے سب شامل تھے، زندگی کے رنگین سفر سے کٹ کر موت کے خاموش سفر پر ایسے روانہ ہو گئے کہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آئیں گے اور اُن کی یاد میں سوگوار آنکھیں برسوں روتی رہیں گی۔

پاکستان کی تاریخ میں یہ ایک انتہائی المناک واقعہ ہے۔ اس سے قبل بھی اس قسم کے حادثات ہو چکے ہیں اور سینکڑوں مسافروں کی جانیں معمولی غفلت سے تلف ہو چکی ہیں۔ اس حادثے نے پرانے زخموں کو تازہ کر دیا۔ ساتھ ہی سینکڑوں افراد کی بے بسی کی موت کا چرکا ایک بار پھر لگا دیا۔۔۔۔ اس حادثے کے عینی شاہدوں کا کہنا ہے کہ ایسے ایسے المناک مناظر دیکھنے میں آئے کہ پتھر دل بھی پگھل گئے ۔۔۔۔ ماں کی چھاتی سے دو مُردہ بچے چمٹے ہوئے تھے۔ ماں کی آنکھیں کھلی تھیں، شاید اُسے اپنی موت سے زیادہ اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کا غم تھا۔ جن کے لئے اُس نے جانے کتنے خواب سجائے ہوں گے۔

اس حادثے کی خبر سُن کر پورے پاکستان میں کہرام مچ گیا۔ جن کے عزیز و اقارب، رشتہ دار، بھائی بہن اس بدقسمت ٹرین میں سفر کر رہے تھے، ان کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی ۔۔۔۔ کون ہلاک ہوا اور کون زندہ بچا۔ اس سوال نے متعلقہ گھرانوں میں قیامت بپا کر دی۔ حادثے کی رات کو جب لیاقت پور سے آنے والی گاڑی کراچی کینٹ پر پہنچی تو اسٹیشن پر قیامتِ صغرا کا منظر تھا۔ چہروں پر تشویش کی گہری پرچھائیاں تھیں اور آنکھیں عزیزوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جو خوش نصیب یا در تھے بچ گئے اور اپنے رشتہ داروں سے چمٹ رہے تھے۔ جو معمولی زخمی تھے۔



ماں کی چھاتی سے دو مردہ بچے چمٹے ہوئے تھے

وہ اپنے دوستوں کے کندھوں کا سہارا لے کر گھر جا رہے تھے اور شدید زخمی ہسپتال لے جائے جا رہے تھے۔ جن لوگوں کی موت کی خبر کسی نہ کسی طرح پہنچ گئی تھی، ان کے رشتہ دار، عزیز و اقارب، دوست، چاہنے والے پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ موت نے ان کے دلوں پر بڑا گہرا زخم لگایا تھا۔ اب ان کا انتظار فضول ہے۔ وہ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو چکے ہیں جس کی گاڑی کبھی اس اسٹیشن پر نہیں ٹھہرے گی۔

حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ مرنے والوں کا معاوضہ ادا کرے گی۔ مرکزی وزیر ریلوے غلام مصطفیٰ جتوئی نے استعفیٰ پیش کیا مگر صدر صاحب انہیں اس حادثے کا ذمہ دار نہیں سمجھتے لہٰذا ان کا استعفیٰ منظور نہیں کیا۔ البتہ ریلوے بورڈ کے چیئرمین کا استعفیٰ منظور کر لیا شاید وہ اس حادثے کے ذمہ دار ٹھہرا دیئے گئے۔ یہ رموزِ مملکت ہے۔ ہم اتنا جانتے اور سمجھتے ہیں کہ مرنے والے اب کبھی لوٹ کر نہیں آئینگے۔ مرکزی وزیر کے استعفیٰ دینے نہ دینے سے متاثرین کا غم ہلکا نہ ہو گا۔ نہ ہی ہزار دو ہزار روپے قیمتی جانوں کا نعم البدل بن سکتے ہیں۔ زندگی کے جو چراغ بجھ گئے وہ روپے سے دوبارہ جل نہ اٹھیں گے البتہ ہمیں ریلوے کے اس قسم کے حادثات پر سنجیدگی سے غور کرنا ہو گا۔ لیاقت پور حادثے سے قبل بھی ایسے اندوہناک حادثے ہو چکے ہیں۔ اگر ان حادثوں کا شمار کیا جائے تو مرنے والوں کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر جاتی ہے ہمیں اس پہلو پر سوچنا ہو گا کہ آخر ایسے المناک حادثات کیوں ہوتے ہیں؟ حکومت حادثے کے فوری بعد معاوضہ کے اعلان کے ساتھ تحقیقاتی کمیٹی بٹھاتی ہے۔ اور اعلان کرتی ہے کہ اس حادثہ کے ذمہ داروں کو کڑی سزا دی جائے گی۔ ممکن ہے غفلت برتنے والوں کو سزا بھی دی گئی ہو۔ مگر ان اقدامات سے آج تک مثبت نتائج برآمد نہ ہوتے۔ سال دو سال میں ریلوے ایکسیڈنٹ کی خبریں موصول ہو ہی جاتی ہیں۔ اس بار بھی حکومت نے وہی کچھ کیا جو پچھلی حکومتیں کرتی آئی ہیں ——— "مرنے والوں کا معاوضہ ادا کیا جائے گا اور ایک تحقیقاتی کمیٹی کے ذریعہ اس حادثے کی تحقیقات کرائی جائے گی" ——— مرکزی وزیر برائے ریلوے و سیاسی امور جناب غلام مصطفیٰ جتوئی کا استعفیٰ نامنظور اور چیئرمین ریلوے بورڈ کا استعفیٰ منظور ———

کیا حکومت اپنے ان اقدامات سے مطمئن ہے اور کیا وہ سمجھتی ہے کہ آئندہ اس قسم کے حادثات کی مؤثر روک تھام ہو جائے گی اور اہلِ وطن کو ایسی جانکاہ خبر سُننے کا موقع نہیں ملے گا۔ اگر وہ مطمئن ہے تو ہم فی الحال اپنے خدشات کا اظہار نہیں کریں گے۔ اور اگر یہ ساری کارروائی محض رسمی اور عوام کو مطمئن کرنے کی ایک کوشش ہے تو حکومت کو آئندہ اس قسم کے حادثے کے ردِ عمل کی صورت میں ابھرنے والے جذبات کا اندازہ ابھی سے کر لینا چاہیئے۔ عوام بار بار معاف نہیں کرتے۔

کراچی ایئرپورٹ پر
ایک مسافر پر کیا گذری

anglo asian advertising
P.O. Box 4QF, 3 Tottenham Street, London, W.1
Telephone: [illegible]

When I left for the departure lounge and as I was boarding the Coach, another young man of about 35 years informed me that he was a Security Police and that if I had any difficulty at the Airport. I thought at that moment that he was an officer who may wanted to find out if there was any corruption etc. at the Airport. I told him the FACTS and at the end he asked me to pay him Rs.200 otherwise it would be difficult for me to go. I told him that I had only Rs.100 which he knew that I had given to one of his colleagues. He further said " there must be someone who has come to see you off at the Airport". He also said, "you better come with me and ask them for money."

ریاض احمد قریشی کے خط کا عکس

الفتح رپورٹ

سیکورٹی افسر نے دوسو روپے اینٹھ لئے

۱۷- جون ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے۔

اینگلو ایشین ایڈورٹائزنگ لندن کے منیجنگ ڈائریکٹر ریاض احمد قریشی اپنی بیگم شہناز رانی خان کے ساتھ کراچی ائر پورٹ پر پہنچے، وہ کراچی میں پانچ ہفتے قیام کرنے کے بعد عراق ائیرویز کے ذریعے لندن جانے والے تھے۔ لندن ہی میں بزنس کرتے ہیں اور ان کے پاس برطانوی پاسپورٹ ہے۔

وہ جوں ہی ائیرپورٹ پر پہنچے چند افراد ٹہلتے ہوئے ان کے قریب پہنچ گئے اور بڑے پُراسرار انداز میں انہیں امیگریشن کے سلسلے میں اپنے تعاون کی پیش کش کی۔ ریاض احمد حیران ہوئے کہ آخر یہ کون لوگ ہیں اور اس قسم کا تعاون کیوں پیش کر رہے ہیں؟

انہوں نے پوچھا۔ "آخر آپ کون ہیں؟"

جواب ملا "پریشان ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہم پولیس اور امیگریشن افسروں کے دوست ہیں۔ بگڑا کام بناتے ہیں!"

ریاض صاحب نے انہیں جواب دیا۔ "آپ حضرات کا بہت بہت شکریہ۔ میرے پاس سارے کاغذات مکمل ہیں۔ مجھے کسی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس گفتگو کے بعد ریاض احمد امیگریشن کی خانہ پری میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے ڈیوٹی افسر کو اپنا پاسپورٹ پیش کیا۔ اس نے پاسپورٹ چیک کیا اور چند لمحے توقف کے بعد سوال کیا۔ "کیا آپ کے پاس این۔ او۔ سی ہے؟"

ریاض احمد چکرا گئے "نہیں میرے پاس این او سی تو نہیں ہے۔ میرا خیال ہے مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے مزید کہا۔ "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس قانون کا اطلاق کب سے شروع ہوا کیونکہ میں پاکستان میں تقریباً پانچ ہفتے سے مقیم ہوں۔"

افسر نے جواب دیا۔ "میں اس بارے میں کوئی صحیح اطلاع نہیں دے سکتا لیکن ایک روز قبل (۱۶ جون ۱۹۷۲ء) وزارت سے آرڈر موصول ہوا ہے۔"

ریاض احمد نے پریشانی کے عالم میں افسر سے کہا — "جناب ہمارا سامان طیارے میں رکھا جا چکا ہے۔ میری بیوی کو پیر کے دن ڈیوٹی پر پہنچنا ہے۔ میں نے یہاں کے اخبارات میں این۔ او۔ سی کے بارے میں کوئی خبر نہیں پڑھی۔ بالکل لاعلم ہوں۔ خدا کے لیے میری مدد کیجئے۔ یا پھر مجھے طیارے سے سامان اتارنے کی اجازت دیں۔ میں این۔ او۔ سی حاصل کرنے کے بعد اگلے ہفتے چلا جاؤں گا؟"

امیگریشن افسر نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "ذرا ٹھہریئے، میں اپنے سپرنٹنڈنٹ سے بات کر لوں۔"

ریاض احمد ایک طرف کھڑے ہو کر افسر کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک ۲۷ سال کا نوجوان ان کے قریب آیا۔ اس نے بڑی رازداری سے کہا۔ "مجھے آپ کے حادثے کا علم ہے۔ این۔ او۔ سی کے بغیر تو آپ روانہ نہیں ہو سکتے۔ بہرحال اگر آپ سو روپے دیں تو امیگریشن افسر سے پاسپورٹ پر مُہر لگوا دوں گا۔"

ریاض احمد کو وہ نوجوان اس وقت فرشتہ معلوم ہوا۔ انہوں نے فوراً اسے سو روپے دے دیئے۔ وہ پاسپورٹ لے کر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ امیگریشن آفس کے کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں ریاض احمد اور اُن کی بیگم کے تصدیق شدہ پاسپورٹ تھے۔ وہ خاموشی سے دونوں پاسپورٹ دے کر غائب ہو گیا۔

اس کے بعد کیا ہوا یہ ریاض احمد قریشی کی زبانی سُنیئے

"میں روانگی کے لیے لاؤنج سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک اجنبی نے جس کی عمر تقریباً ۳۵ سال کی ہوگی میرے قریب آ کر کہا کہ وہ سیکورٹی افسر ہے۔ اگر مجھے ائیرپورٹ پر کسی قسم کی دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے تو میں اسے بتا دوں۔ چنانچہ میں نے اسے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ اس نے تمام واقعات سننے کے بعد مجھ سے جو کچھ کہا اس سے میں دہل گیا۔ یا اللہ! یہاں تو آوا کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ اس نے کہا:۔

"یہ تو بہت غلط بات ہے کہ آپ این۔ او۔ سی کے

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

RETURNEE RESIDENTS

Lahore, June 24: People who are settled abroad and are on a short visit to Pakistan (Returnee Residents) do not need any "No-objection Certificate" for leaving the country if they are travelling by air, it was officially announced.

Their Returnee Resident status, however, would be verified by the immigration authorities at the airports before they were allowed to leave Pakistan.— APP.

"غیر ممالک میں مقیم پاکستانیوں کے لئے این او سی کی ضرورت نہیں۔" (حکومت پاکستان کا اعلان)

محمود شام

۵/۸/۷۲

آخری رقص

رنگ۔ جو پھیل گئے
ساز۔ جو شور بنے
تاک دھنا، تھاپ، تھئی، تھئی، تھاپ، تھئی، تھئی
تان، تنن، تان، تنن
ڈن، ڈن، ڈن، ڈن، ڈن
آج کا رقص کہیں
آخری رقص نہ ہو
ہر طرف تیز دھنیں
اور ہم کچھ نہ سنیں
عقل ماؤف ہوئی
ذہن مفلوج ہوا
آج ہر شخص کو حق ہے کہ وہ چیخے، چیخے
آج ہر ساز سے ہر تان سلو
ساز جو ٹوٹتا ہے، ٹوٹے، ٹوٹے
دم جو گھٹتا ہے گھٹے اور گھٹے

رنگ بھی پھیلتے ہیں تو پھیلیں
جسم کٹتا ہے تو کٹ جائے، بکھر جائے
کوئی ہم رقص نہ رکنے پائے
کوئی بھی ساز نہ دبنے پائے
آخری رقص سہی
آخری رات سہی
آخری جاز سہی
آخری گیت سہی
آخری ساز سہی
آخری باب سہی
آخری جسم سہی
صبح کی فکر کسے
کل ہے کیا، درد کسے
تاک دھنا تھاپ تھئی، تھاپ تھئی
تھئی، تھئی، تھئی، تھپ تھپ، تھا

احسان عظیم صدیقی۔ کوٹری

سندھ میں
دیہی آبادی کا تناسب ۶۰ فیصد ہے

گذشتہ دنوں بعض حلقوں کی جانب سے اُردو زبان کے حق میں ایک طوفان کھڑا کیا گیا۔ اُردو کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ راتوں رات اُردو صوبہ میں بدل گیا اور پھر پنڈی مذاکرات میں ملازمتوں کی ضمانت کے سمجھوتے پر فتح کا نقارہ بجایا گیا۔ مطالبہ کرنے والوں میں دیگر افراد کے علاوہ جنگ کے دیرینہ ایڈیٹر سید محمد تقی بھی شامل تھے۔ سندھی زبان کے آرڈیننس کے نفاذ کے بعد خیال تھا کہ زبان کا تنازعہ ختم ہو گیا لیکن ۲۷، ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء کے الفتح کے شمارے میں سید محمد تقی صاحب نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر سندھ میں سرکاری زبان کے تنازعہ کے حل کے طور پر اُردو صوبہ یعنی سندھ کی تقسیم کا نعرہ لگایا ہے اور اپنے موقف کی تائید کے لیے فرضی حقائق کے ذریعے گمراہی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک واقف کار شہری کی حیثیت سے موصوف کے غیر حقیقی اور فرضی خیالات کی تردید کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

تقی صاحب کے خیالات کے درج نکات خاص طور پر قابلِ ذکر اور قابلِ غور ہیں:

- اُردو اور سندھی دونوں زبانوں کو سندھ کی سرکاری زبان بنانا مارکسزم کی کسوٹی کے مطابق صحیح ہے۔
- سندھ میں ہاریوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے
- محنت کش طبقہ اردو کا حامی ہے یا سندھی کا؟
- سندھ کی دیہی آبادی ۳۵ فیصد اور شہری آبادی ۶۵ فیصد ہے۔
- شہروں میں رہنے والے محنت کشوں کی زبان اردو ہے۔
- چھوٹے تاجروں کلرکوں وغیرہ کی تحریک بھی انقلابی ہوتی ہے۔
- صوبہ سندھ کے نام کی وجہ سے سندھی زبان سرکاری زبان قرار دی گئی ہے۔
- سندھ میں تیرہ "۱۳" زبانیں بولی جاتی ہیں اس لیے سندھ کو تیرہ لسانی منطقوں میں بانٹنا پڑے گا۔
- سندھ کو دو لسانی منطقوں میں تقسیم مسئلہ کے حل کا ایک طریقہ ہے۔
- ریفرنڈم کا طریقہ واضح طور پر جمہوری ہے لیکن اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ ہر دو زبان کے حامی نتائج تسلیم نہیں کر سکتے۔

تقی صاحب کے خیال میں مارکسزم کی کسوٹی کے مطابق "اُردو اور سندھی دونوں صوبے کی زبانیں ہیں"۔ زبان کے بارے بارے میں مارکسزم وہ نہیں ہے جو تقی صاحب نے بیان کیا ہے بلکہ مارکسزم کی مارکس اینگلز، لینن، اسٹالن اور ماؤزے تنگ جیسے حقیقی اور باعمل انقلابیوں نے آبیاری کی ہے۔ ان کے مطابق سماج کی تمام بولیوں اور زبانوں کو یکساں طور پر ترقی کرنے کا حق ہے اور اس حق کی بجا آوری کے لیے مادری زبان میں تعلیم اور انفرادی و اجتماعی طور پر بلا روک ٹوک استعمال کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے اسے اصولی طور پر خالص جمہوری انداز میں یعنی اکثریت کی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا جاتا ہے۔ روس میں روسی کو سرکاری زبان، چین میں یان قومیت کی زبان کو سرکاری زبان بنانے سے ملتی ہے۔ زبان کی سرکاری حیثیت کے سلسلے میں سرمایہ دارانہ جمہوریت بھی اسی اصول پر گامزن ہے مثلاً امریکہ میں جرمنی، اسپنش وغیرہ کے مقابلے میں انگریزی زبان کا سرکاری ہونا اس بات کا ثبوت ہے

تقی صاحب کا یہ خیال بھی خلافِ حقیقت ہے کہ سندھ میں ہاریوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اگر تقی صاحب ۱۹۶۱ء کی مردم شماری اور ۱۹۶۷ء کے زرعی سروے کی رپورٹیں یا پھر سندھ کو حقیقی طور پر دیکھا ہوتا تو شاید اتنا بڑا جھوٹ بولنے کا انہیں حوصلہ نہ ہوتا۔ بہر حال ملک کے سبھی شہری خیالی دُنیا میں نہیں رہتے بلکہ سماج کے ٹھوس حقائق کا سامنا کرتے ہیں اور اس کا ادراک رکھتے ہیں۔ تقی صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سندھ کی آبادی کا تخمینہ تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ ہے اور اس کی ۶۵ فیصد آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ جہاں تک ان کی طبقاتی تقسیم کا تعلق ہے حقیقی صورت حال یہ ہے کہ طبقاتی طور پر سندھ کی سب سے بڑی اکثریت ہاری ہیں۔ ان کی تعداد تقریباً ساٹھ لاکھ ہے۔ دوسرے نمبر پر صنعتی مزدور ہیں جن کی تعداد ۱۵ لاکھ ہے اس طرح بقیہ ۴۵ لاکھ افراد خوش حال کسان، درمیانہ طبقہ، چھوٹے تاجر، ملازمت پیشہ، نیم مزدور، دستکار، زمیندار، سرمایہ دار وغیرہ شامل ہیں۔

بڑی اکثریت والے ہاری سندھی زبان کو سرکاری زبان بنانے کے حق میں ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی واضح اکثریت اور خواہش کے پیشِ نظر ہی انگریزوں نے سندھی کو سندھ کی سرکاری زبان کے طور پر بحال کیا اور سندھی بطور سرکاری زبان صرف ان ہاریوں کی وجہ سے ہی پاکستان کے بعد یہاں تک کہ ایوب شاہی کے دَور میں بھی بحال رکھی گئی جس کی تصدیق ریونیو ریکارڈ، ماتحت عدالتوں اور محکمہ پولیس کی کارروائیوں سے کی جاسکتی ہے۔

اس سوال کے جواب کے لیے کہ آیا محنت کش طبقہ (صنعتی مزدور) اُردو کا حامی ہے یا نہیں، ہمیں ٹھوس معروضی تجزیہ کرنا چاہیئے۔ سندھ میں صنعتی مزدوروں کی تعداد تقریباً ۱۵ لاکھ ہے۔ زبان کے لحاظ سے اُن کی اکثریت یعنی تقریباً آٹھ لاکھ مزدور پشتو بولنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی بنگالی، گجراتی، بلوچی اور سندھی بولنے والے مزدور بھی تقریباً چار لاکھ ہیں۔ تقریباً تین لاکھ مزدور ایسے ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے اس طرح اُردو کے حق میں مزدوروں کا صرف پانچواں حصہ ہی حامی کے طور پر تلاش کیا جاسکتا ہے جبکہ بقیہ چار حصے نہ تو اردو دان ہیں اور نہ ہی اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لیے کسی سرگرمی یا دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ مزدوروں کی اکثریت کا اردو زبان کو سرکاری زبان

آپ کی "اردو ریاست" میں مہاجروں کا درجہ کیا ہوگا؟

کے حق میں نہ ہونے کا ثبوت اس حقیقت سے بھی مل سکتا ہے کہ اردو کو سرکاری زبان بنانے کا حالیہ ہنگامہ کراچی، حیدرآباد جیسے بڑے اور صنعتی شہروں میں اٹھایا گیا اور تقی صاحب جو خود اس معرکہ آرائی کے قائدین میں سے ایک ہیں انہیں خود بھی معلوم ہوگا کہ اُن کی تحریک درمیانے طبقے اور ملازمت پیشہ افراد کے گرد ہی گھومتی رہی۔ صنعتی علاقے منگھو پیر، لانڈھی اور کورنگی اُن کی تمام تر خواہشات اور کوشش کے باوجود نام نہاد اُردو تحریک میں نہ صرف شریک نہیں ہوا بلکہ مخالفت بھی کی۔ اسی طرح حیدرآباد، کوٹری، ٹنڈو آدم، ٹنڈو محمد خاں، نواب شاہ اور سکھر وغیرہ کے صنعتی مزدوروں نے بھی کھلے طور پر اس کی مخالفت کی بلکہ کرفیو کے دوران پیداواری سرگرمیاں جاری رکھیں۔

تقی صاحب نے شاید خود کی تسکین کے لیے یہ مفروضہ بھی گھڑا ہے کہ سندھ کی دیہی آبادی ۳۵ فیصد اور شہری آبادی ۶۵ فیصد ہے۔ موصوف کا یہ مفروضہ غلط بیانی اور دن کو رات کہہ کر حقائق کا منہ چڑانے کی ایک کوشش کے علاوہ کچھ نہیں کیونکہ سندھ کے گیارہ اضلاع میں کراچی کے علاوہ بقیہ تمام اضلاع میں دیہاتی آبادی کی اکثریت ہے۔ تصدیق کے لیے مردم شماری کی رپورٹ دیکھی جاسکتی ہے۔ کراچی کے بعد حیدرآباد سندھ کا سب سے بڑا شہر ہے اور غیر سندھی آبادی کا تناسب کراچی کے علاوہ اور دیگر شہروں سے سب سے زیادہ ہے۔ صرف حیدرآباد کے اعداد و شمار کے ذریعہ ہی یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ صورت حال کیا ہے کیونکہ بقیہ اضلاع کے بارے میں تو تقی صاحب خود بھی جانتے ہوں گے کہ اکثریت سندھی بولنے والوں پر مشتمل ہے۔

۱۹۶۱/۶۱ کی مردم شماری کے لحاظ سے :-

حیدرآباد ضلع کی مجموعی آبادی	۱۲۸۵۷۱۱
شہری آبادی	۵۱۴۴۵۴
دیہی آبادی	۷۷۱۲۵۷

اس طرح شہری آبادی ۴۵ فیصد ہے اور دیہی آبادی ۶۰ فیصد ہے۔ حیدرآباد ضلع میں زبان کی بنیاد پر تقسیم کی حقیقت مندرجہ ذیل ہے :-

۱۔ بنگالی	۴۳۸۵	۷۔ بروہی	۸۱۹۷
۲۔ پنجابی	۶۶۳۸۸	۸۔ فارسی	۷۹۵۰
۳۔ پشتو	۲۲۸۲۰	۹۔ عربی	۱۴۸۹۸
۴۔ سندھی	۸۷۸۸۳۰	۱۰۔ انگریزی	۴۶۳۲۶
۵۔ اُردو	۳۹۵۵۹۱	۱۱۔ کشمیری	۴۴
۶۔ بلوچی	۳۵۵۰۰	۱۲۔ راجستانی	۱۳۱۲۲
۱۳۔ گجراتی	۱۰۶۵۳		

اس طرح سندھی بولنے والوں کا اشاریہ تقریباً ۶۰ فیصد ہے جبکہ اُردو بولنے والے صرف ۳۰ فیصد ہے۔ سندھ کے دیگر اضلاع میں اردو بولنے والوں کا تناسب بھی کم ہے۔ اس طرح ٹھوس حقائق تقی صاحب کے اس خود ساختہ خیال کی تردید کرتے ہیں کہ اردو بولنے والے اکثریت میں ہیں اور یہ کہ شہری آبادی دیہی آبادی سے زیادہ ہے۔

تقی صاحب کے بارے میں مشہور رہا ہے کہ موصوف کسی زمانے میں خود بھی انقلابی کہلاتے تھے۔ اور انقلاب اور طبقاتی حیثیت کے بارے میں واقفیت رکھتے ہیں۔ اِن سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ایسی غلط باتیں کہیں گے۔ طبقاتی تجزیہ کے مطابق یہ صرف مزدور طبقہ ہے جو سماج کی تبدیلی یعنی انقلاب کا متمنی اور انقلاب لانے والا

قوموں کے حقوق
الفاظ کی بازی گری
اور فرضی حکایتوں سے
نہیں دبائے جاسکتے

ہے اور اس کا قریب ترین ساتھی کسان۔ دیگر طبقات اور گروہ بنیادی طور پر اس نظام کی بنیاد یعنی ذاتی ملکیت کے حامی ہیں لیکن گروہی مفاد کے تحت حکمران گروہوں سے تضاد رکھتے ہیں۔ مزدور طبقہ کی انقلابی جدوجہد کے دوران ان کا ایک گروہ انقلاب کی حمایت کرتا ہے وہ بذاتِ خود انقلابی طبقہ نہیں ہوتے نہ انقلاب کے ہراول بن سکتے ہیں بلکہ انقلابی طبقہ کی جدوجہد میں ان کی کامیابی دیکھتے ہوئے اپنے گروہی مفادات کے پیش نظر انقلاب کی حمایت کرتے ہیں جہاں تک زبان کی سرکاری حیثیت کے لیے حالیہ ہنگاموں کا تعلق ہے اس کا انقلاب سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ تو انقلابی جدوجہد کو روکنے کی ایک کوشش تھی لہٰذا اس کے محرکین اور علمبرداروں کو انقلابی بنا کر پیش کرنا انقلاب کا منہ چڑانا ہے۔

یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ سندھی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے مدعی صرف اس لیے سندھی کا نام لیتے ہیں کہ صوبے کا نام سندھ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھی زبان دُنیا کی قدیم ترین زبانوں میں سے ایک ہے اور اس کے بولنے والوں کی اکثریت سندھ میں آباد ہے۔ زبان بولنے والوں کی اکثریت کا یہ استحقاق ہے کہ وہ اپنی زبان کو سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کریں خصوصاً ان حالات میں کہ وہ ماضی میں بطور سرکاری زبان رائج رہی ہے اور یہ کہ حکمراں گروہ نے اپنے مفادات کے پیش نظر ون یونٹ بنا کر ناجائز طور پر اسے اس کے حق سے محروم کیا تھا۔ ون یونٹ ٹوٹنے کے بعد منطقی طور پر وہ اپنی پرانی حیثیت اختیار کرسکتی ہے اور جمہوری طور پر بھی اسے اپنی حیثیت قائم کرنے کا حق ہے

تقی صاحب کا یہ کہنا کہ سندھ میں چونکہ تیرہ زبانیں بولی جاتی ہیں اس لیے سندھ کو تیرہ لسانی منطقوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے یا پھر اُردو اور سندھی دونوں کو سرکاری زبان بنانا چاہیے۔ تقی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ سندھ کی تمام اقلیتی زبانیں کسی ایک علاقہ میں محدود نہیں ہیں بلکہ اس کے بولنے والے بکھری ہوئی شکل میں پورے سندھ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس طرح کسی تقسیم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ان کی منطق کو تسلیم کرلیا جائے تو چونکہ دُنیا کے ہر حصے میں اردو بولنے والے موجود ہیں اس لیے ہر ملک میں اُردو کو سرکاری زبان بنانا چاہیے یا پھر ہر ملک کے ایک ٹکڑے کو اُردو صوبہ قرار دینا چاہیے انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ تیرہ زبانوں کی بات کرکے صرف دو زبانوں کو سرکاری بنانے کا مطالبہ کرنا بددیانتی کی ایک بدترین مثال ہے اگر تقی صاحب کے پاس انصاف کا کوئی عنصر ہے تو انہیں یہ مطالبہ کرنا چاہیے تھا کہ ہر زبان کو سرکاری بنا دیا جائے تاکہ تمام زبانیں بولنے والوں کے ساتھ انصاف ہو سکے لیکن وہ خود جانتے ہیں کہ تیرہ زبانیں سرکاری نہیں بن سکتیں اس لیے اکثریت کی زبان کو سرکاری بنانا انصاف اور جمہوریت کی رُو سے لازمی ہے اور چونکہ سندھی زبان سندھ کے ۶۰ فیصد عوام کی زبان ہے اس لیے اسے لازماً سرکاری زبان ہونا چاہیے

تیرہ زبانوں کی بحث چھیڑ کر سندھ کی تقسیم کا جواز پیدا کرنا سندھ دشمنی کی بدترین مثال ہے۔ کیونکہ اردو داں حضرات سندھ کے کسی ایک خطہ پر کُلّی طور پر آباد نہیں ہیں بلکہ سندھ

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

"عورتوں کا معاشی اور سیاسی رتبہ بلند کرنے کیلئے متحد ہو جاؤ"

(چیئرمین ماؤ زے تنگ)



مجھے ۸۱ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ نیا لباس نصیب ہوا

مسز روز اسمتھ برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کی بانی رکن ہیں۔ ان کی عمر اسی برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ لیکن صحت آج بھی قابل رشک ہے۔ ان دنوں پیکنگ میں مقیم ہیں اور سنہوا خبر رساں ایجنسی کے لئے کام کرتی ہیں۔ برطانیہ میں کمیونسٹ پارٹی کے قیام سے کافی عرصہ پہلے سے بائیں بازو کی مزدور تحریک میں سرگرم تھیں۔ آج بھی برطانیہ کی انقلابی تحریک کے ساتھ بسا اوقات زندہ رابطہ رکھے ہوئے ہیں۔ بین الاقوامی انقلابی تحریک پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ اس پیرانہ سالی میں بھی نہ ان کی آنکھ کی چمک ماند پڑی ہے نہ ذہن کی روشنی۔ مسز اسمتھ برطانیہ کی نصف صدی کی انقلابی تاریخ کی گواہ ہی نہیں اس کی سرگرم کردار رہی ہیں۔ (ادارہ)

ایک روز کھانے کی میز پر ہی میں نے کہہ دیا۔ "مسز اسمتھ میری آرزو ہے کہ آپ کی زندگی اور تجربات کے بارے میں کسی قدر تفصیل جاننے کا موقع ملے۔"

"میں کیا اور میری زندگی کیا۔ اپنی باتیں کرنا آدمی اچھا نہیں لگتا۔" بڑا کورا جواب تھا۔

"لیکن اگر کوئی آپ کی وساطت سے برطانیہ میں انقلابی تحریک کے کردار، اس کی ناکامیوں اور کامیابیوں کا تجزیہ کرنا چاہے تو کیا آپ اس کی مدد نہیں کریں گی؟" میں نے کہا۔

وہ کچھ سوچنے لگیں۔ پھر بولیں: "ہاں اس زاویے سے بات ہو سکتی ہے۔ تم کسی اخبار کے لئے لکھتے ہو نا!"

"ہاں لکھتا تو ہوں۔"

"تو اخبار میں میرا اشتہار شائع کراؤ گے؟"

"شائع ضرور ہو گا لیکن وہ اشتہار ہرگز نہیں ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے مقصد کی وضاحت کر چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے کسی بھی شام کو کھانے کے بعد آ جانا۔"

"تو میری تجویز ہے کہ وہ کوئی شام کل کی شام ہو جائے" میں نے جواباً کہا۔

اور دوسری شام جب میں مسز اسمتھ کے فلیٹ میں پہنچا تو انہوں نے فیصلہ دیا کہ ہمارے مابین اخباری انٹرویو کی بجائے دو طرفہ دوستانہ گفتگو ہونی چاہیئے۔ اس پر کسی اختلاف کی گنجائش نہیں تھی۔ ساتھ ہی میں نے سوال داغ دیا۔

"کیا آپ اپنے خاندانی اور طبقاتی پس منظر پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گی۔؟"

"میرا خاندانی نام ایلیس ہے۔ میرے آباؤ اجداد ڈربی شائر میں رہتے تھے اور ظروف ساز تھے۔ میرے والدین کے ہاں نو بچے پیدا ہوئے۔ جن میں ہم سات زندہ رہے۔ ہمارا قیام کان کنوں کی بستی میں تھا۔ میرے والد بڑے ذہین اور اعلیٰ پائے کے کاریگر تھے۔ انہیں اس بے رحم حقیقت کا بہت قلق تھا کہ ان کی پوروں سے ڈھلے ہوئے فنی نمونے امراء کے ڈرائنگ روموں کی زینت تو بنتے ہیں لیکن اُن کے اپنے بچوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کو

لوٹ کھسوٹ کے نظام نے مجھے بغاوت پر اُکسایا

بھی پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ میری والدہ اگرچہ بالکل ان پڑھ تھیں لیکن بڑی باہمت اور سلجھی ہوئی عورت تھیں۔ ہم بے حد غریب تھے۔ اس کے باوجود میری والدہ کی شدید خواہش تھی کہ ہم بہن بھائی کسی نہ کسی طرح میٹرک تک ضرور تعلیم حاصل کریں۔ گھر کا سارا کام تو کرتی ہی تھیں۔ ہماری تعلیمی ضروریات میں کسی حد تک ہاتھ بٹانے کے لئے انہوں نے دوسروں کے کپڑے دھونے اور صفائی وغیرہ کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔"

س: عملی سیاست میں دلچسپی آپ کو ورثے میں ملی ہے یا آپ کی اپنی افتادِ طبع کا نتیجہ ہے؟

ج:۔ میرے ذہن کی تشکیل میں ان دونوں عوامل کا حصّہ ہے۔ تاہم میرے طبقاتی پس منظر کو اس میں زیادہ دخل حاصل ہے۔ میرے والد بڑے پکے ٹریڈ یونینسٹ تھے۔ اور باغی مزاج رکھتے تھے۔ بغاوت کا یہ رجحان انہیں ورثے میں ملا تھا۔ ان کے تینوں چچا چارٹسٹ تحریک کے بڑے سرگرم کارکن تھے۔ حکومت نے سزا کے طور پر ان کے ایک چچا کو سیرالیون جلاوطن کر دیا تھا۔ اور دو کو آسٹریلیا جلاوطن کر دیا تھا۔ میرے والد اعلیٰ پائے کے کاریگر اپنے فن کی قیمت نیم فاقہ کشی کی صورت میں وصول کرتے تھے۔ وہ ایسے نظام کو بدلنے کی زبردست خواہش رکھتے تھے جس میں محنت کا دامن ہمیشہ خالی رہتا ہے۔ یہ بے اطمینانی مجھے ورثے میں ملی ہے۔

میرے گرد و پیش کا ماحول بڑا ہی تکلیف دہ بڑا ہی روح فرسا تھا۔ ہر دوسرے چوتھے روز ہماری بستی کا کوئی نہ کوئی کان کن مزدور حادثے کی نذر ہو جاتا۔ اس زمانے میں مزدور قوانین تک نہیں بنے تھے نہ زخمی یا ناکارہ ہونے والے کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اموات بھی ہو جاتی تھیں۔ جب کوئی مزدور حادثے کا شکار ہوتا تو کانوں کے مالکان بس اتنی مروت کرتے کہ اُسے گھوڑا گاڑی میں ڈال کر ہماری لمبی سی غلیظ گلی میں چھوڑ جاتے۔ اس کے بعد کوئی پرسانِ حال نہ بنتا۔ یوں تو سب صنعتی مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی لیکن کان کنوں کی اجرت خاص طور پر نہایت قلیل تھی میرے اپنے دو بھائی کان کن تھے۔ یہ حالات مجھے اس نظام کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرنے کے لئے کافی تھے۔

س: آپ یہاں ماہرِ زبان کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ یوں بھی آپ کی زبان بہت خوبصورت ہے۔ کیا میرا یہ قیاس درست ہے کہ آپ کے والدین نے آپ کو خاص اچھی تعلیم دلوائی ہو گی؟

ج: یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے والدین نے ہماری تعلیم کے لئے اپنی بساط سے بڑھ کر قربانی دی لیکن یہ قیاس درست نہیں کہ مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ہو گا۔ آجکل سیکنڈری اسکول تک تعلیم مفت ہے۔ ہمارے زمانے میں ایسا نہیں تھا۔ ہمیں اپنے باپ کی ذہانت ورثے میں ملی تھی۔ اس لئے ہم سب بہن بھائیوں نے پرائمری میں وظیفہ حاصل کیا تھا۔ وظیفے کی یہ چھوٹی سی رقم اور ہماری والدہ کی محنت مزدوری کی بدولت اس قدر ہوا کہ ہم سب ہی میٹرک کر گئے کتاب یا اسٹیشنری وغیرہ خریدنے کے لئے کبھی کبھی میں خود دوسرے لوگوں کے گھروں میں صفائی وغیرہ کر دیا کرتی تھی۔ اس زمانے میں اس کا معاوضہ صرف چھ پنس ملتا تھا۔ پھر میلوں پیدل چل کر کتابیں اور کاپیاں خریدنے جایا کرتی تھی۔ مجھے اٹھارہ برس کی عمر میں زندگی میں پہلی مرتبہ کپڑوں کا نیا جوڑا نصیب ہوا تھا۔ ورنہ ہمیشہ اترن پر ہی گزارہ ہوتا۔

پندرہ سال کی عمر میں میٹرک کرنے کے بعد میں نے ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہاں پہلے سال کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ یہ ابتدائی تربیت تھی۔ اس کے بعد کالج میں دو سالہ تربیتی کورس پاس کرنے کے بعد تدریسی سرٹیفکیٹ ملتا تھا۔ میرے ماحول میں تو لڑکے لڑکیوں کا پندرہ برس کی عمر تک اسکول میں پڑھنا ہی عیاشی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ میں اپنی تعلیم کی تکمیل کئے بغیر غیر سند یافتہ معلّمہ بن گئی۔ اور یوں سالانہ ساٹھ پونڈ تنخواہ پانے لگی۔

س: آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

ج: میں نے سولہ سال کی عمر میں مزدور تحریک میں کام شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے میں برطانیہ میں سوشل ڈیمو کریٹک فیڈریشن کے نام سے بائیں بازو کی تحریک جاری تھی۔ میں نے اس کی رکنیت اختیار کر لی۔ اس تحریک کی سرگرمیوں کا محور مزدور انجمنیں تھیں۔ میں نے سب سے پہلے گتے کے بکس بنانے والی ایک بہت بڑی فیکٹری میں کام کرنے والی لڑکیوں کو منظم کیا۔ اس کام کے دوران مجھے بڑے دلچسپ اور سبق آموز تجربات حاصل ہوئے۔ ان مزدور لڑکیوں کو روزانہ دس گھنٹے کام کی ہفتہ وار مزدوری صرف چھ سے سات شلنگ ملتی تھی۔ میں چونکہ زیرِ تربیت اسکول ٹیچر تھی، اس لئے یہ لڑکیاں مجھے خود سے مختلف سمجھتی تھیں۔ چنانچہ جس طریقہ سے انہوں نے میرا سواگت کیا وہ خاصا حوصلہ شکن تھا۔ ایک لڑکی نے تو گھوڑے کی لید تک مجھ پر پھینکی۔ یہاں مجھے پہلی دفعہ یہ سبق ملا کہ مزدور صرف ایسے لوگوں پر اعتماد کرتے ہیں جنہیں وہ اپنے میں سے سمجھیں۔ لہٰذا میں نے خود پس منظر میں رہ کر وہاں کام کرنے والی چند شناسا لڑکیوں کو آگے بڑھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونین بن گئی۔ متحدہ جدوجہد کے ذریعے اجرت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کے صرف دو سال بعد میں اپنے قصبے کی ٹریڈز کونسل کی رکن بن چکی تھی۔ اس زمانے میں برطانیہ کی عورتیں شاذ و نادر ہی مزدور تحریک میں کام کرتی تھیں۔ لہٰذا عورت ہونے کے ناطے مجھے ٹریڈ یونین کارکن کی حیثیت سے تھوڑے ہی عرصے میں خاصی شہرت حاصل ہو گئی۔

س: مسز اسمتھ کیا آپ اس پر روشنی ڈالیں گی کہ اُس زمانے کی خواتین مزدور تحریک یا سیاسی زندگی سے بالعموم بے تعلق کیوں رہتی تھیں۔

ج: میرے زمانے میں مغرب کی عورت وہ نہیں تھی جو آج ہے۔ تمہارے ملک میں، تو اب بھی غالباً عورتیں سیاست سے بالعموم الگ تھلگ ہی رہتی ہیں۔ ہمارے ہاں کی حالت ان دنوں کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ تمہیں ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ بتاتی ہوں۔ عام رواج کے مطابق میری فراک ٹخنوں کو ڈھانپتی تھی۔ ایک دفعہ میں نے اسے نیچے سے کاٹ کر دو انچ چھوٹا کر لیا۔ تو میری والدہ بے حد خفا ہوئیں۔ یہاں تک کہہ دیا کہ کسی کے ساتھ بھاگ جانے کا ارادہ تو نہیں۔ اور اب لڑکیاں منی اسکرٹ پہنتی ہیں۔ تمہارے لئے سماجی زندگی کے اس مخصوص دور اور اس کے تقاضوں کو سمجھنا شاید زیادہ مشکل نہ ہو۔

س:۔ تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ کے والدین اور بھائی وغیرہ آپ کی سیاسی سرگرمیوں پر معترض ہوتے ہوں گے

ج: میں بتا چکی ہوں کہ میرے والد خود مزدور تحریک سے وابستہ تھے اور باغی مزاج رکھتے تھے۔ اس لئے وہ میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اور میری سرگرمیوں پر فخر کرتے تھے۔ البتہ ایک اور وجہ سے ہمارے مابین شدید اختلاف ہو گیا تھا۔ اس کا ہم دونوں کو ہمیشہ قلق رہا۔ ہوا یوں کہ میرا ایک بھائی مسلسل بے روزگاری اور

مزدور صرف اپنے ہی طبقہ کے لوگوں پر اعتماد کرتے ہیں

بعض دوسری مجبوریوں سے تنگ آ کر پہلی عالمی جنگ کے دوران فوج میں بھرتی ہو گیا۔ میں بھی اور میرے والد بھی اصولی طور پر بین الاقوامی سرمایہ دارانہ تضادات سے جنم لینے والی اس جنگ میں شمولیت کو غلط سمجھتے تھے۔ میں کہہ چکی ہوں کہ بے روزگاری کے علاوہ بھی میرے بھائی کی کچھ پریشانیاں تھیں۔ میرے والد نے پدرانہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اُسے فوج میں بھرتی ہونے کی اجازت دی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ میرے والد نے کمزوری کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس مسئلے پر گھر میں کئی دفعہ بحث ہوئی۔ ایک روز یہ بحث تکرار کی صورت اختیار کر گئی۔ والد نے غصّے میں کہہ دیا کہ تم ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہو۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم علیحدہ ٹھکانہ کر لو۔ چنانچہ میں ونڈسر چلی گئی۔

س: آپ کی شادی کب اور کیسے ہوئی؟

ج: میری شادی ۱۹۱۶ء میں ونڈسر میں قیام کے دوران ہوئی تھی۔ میرے میاں بھی سوشل ڈیموکریٹک فیڈریشن سے وابستہ تھے۔ طبقاتی لحاظ سے مزدور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور مارکسزم کا مطالعہ بھی کرتے تھے۔ ان مشترک خصوصیات نے ہمیں رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔ شادی کے وقت وہ فوج میں تھے۔ صرف ایک ماہ کے بعد انہیں فرانس بھجوا دیا گیا۔ میں ونڈسر ہی میں رہی۔ ۱۹۱۹ء کے اوائل میں وہ فوج سے فارغ ہوئے تو ہم نوٹنگھم شائر کاؤنٹی میں میسنفیلڈ نامی صنعتی شہر میں منتقل ہو گئے۔ میرے میاں آرٹسٹ بھی تھے۔ سائن بورڈ لکھنے کا دھندا کرنے لگے۔ اور میں کان کنوں میں سیاسی کام کرنے لگی۔

س: آپ پارٹی میں کب شامل ہوئیں؟

ج: میسنفیلڈ میں ہم لوگوں نے مارکسٹ اسٹڈی گروپ قائم کر رکھے تھے۔ یہ پارٹی کے قیام کی تیاریوں کا زمانہ تھا۔ ایک طرف جنگ کی تباہ کاریوں نے نظامِ سرمایہ کے اندرونی تضادات کو ننگا کر کے عوام کے لئے فکر کی نئی راہیں کھول دی تھیں۔ دوسری طرف انقلابِ اکتوبر کی فتح نے پرولتاریہ کو خود اعتمادی کی فراواں دولت بخش دی تھی۔ سماجی زندگی میں ایسا ابھار پیدا ہو گیا تھا جو حوصلوں کو بڑھا دیتا تھا۔ ان دنوں ہم لوگوں نے بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ کام کیا۔ ۱۹۲۱ء میں جب پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو میں بھی اس کی رکن بن گئی۔ یوں میں پارٹی کے بانی ارکان میں سے ہوں۔ میسنفیلڈ میں میرا قیام ۱۹۲۶ء کی جنرل اسٹرائک تک رہا اس دوران مجھے پارٹی کے ہفت روزہ ترجمان "دی ورکر" کی نامہ نگاری کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔

س: مسز اسمتھ، آپ دونوں میاں بیوی ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ کیا میرا یہ قیاس درست ہے کہ انقلابی کام کے سلسلے میں ایک دوسرے کی خوب ہمت بندھاتے ہوں گے ——؟

ج: مجھے افسوس ہے کہ تمہارا خیال درست نہیں اصل صورتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ میرے میاں انقلابی فلسفہ پڑھنے کے باوجود کبھی خود کو انقلابی عمل میں جذب نہیں کر پائے تھے۔ وہ مارکسزم کا خوب مطالعہ کرتے تھے یا شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ انہیں خود اپنی ذات سے بڑی محبت تھی۔ بچوں تک پر مناسب توجہ نہیں دیتے تھے۔ میں کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ اپنے شہر کی پارٹی برانچ کی سیکرٹری تھی مزدوروں میں بہت ہر دلعزیز تھی۔ بڑے بڑے جلسوں کو خطاب کرتی تھی اس سے میرے میاں کی فنکارانہ انا مجروح ہوتی تھی۔ انہوں نے یہ کامپلیکس پال لیا تھا کہ میرے ابھر کر نمایاں ہونے سے گویا ان کی شخصیت دب گئی ہے۔ اس لیے وہ عجیب ذہنی کشمکش کے شکار ہو گئے تھے۔ مجھ پر کسی قدر فخر بھی کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ دل میں شدید حسد کی بھی پرورش کرتے رہے۔ میں اس صورتِ حال کو بخوبی سمجھتی تھی لیکن "کومٹمنٹ" کے جس مقام پر میں پہنچ چکی تھی وہاں سے لوٹنا میرے بس میں نہیں تھا۔ لاوا اندر ہی اندر ابل رہا تھا میں اس طوفان کو ٹالنے کے لیے اپنی سی کوششیں کرتی رہی۔

"میں نے اپنی فراک
دو انچ چھوٹی کر لی
تو امّی
سخت خفا ہوئیں"

ہر ممکن طریقے سے میاں کی دلداری کرتی۔ تنظیمی کام کے لیے جانا ہوتا یا جلسوں وغیرہ کو خطاب کرنا ہوتا تو جڑواں بچوں کو بچہ گاڑی میں ڈال کر ساتھ لے جاتی۔ میاں کو وقت پر کھانا کھلانے کے لیے التزام کے ساتھ آتی اور پھر واپس کام پر چلی جاتی۔ مزدور اس جذبے کی بہت قدر کرتے تھے لیکن میری یہ کوششیں ذہنوں کے فاصلے کو پاٹنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

طوفان امڈتا چلا آتا تھا۔ حالات کی آندھیاں سراسر مخالف سمت میں چل رہی تھیں۔ ۱۹۲۶ء کی جنرل اسٹرائک جزوی طور پر ناکام ہو گئی تھی۔ تمام سرگرم کارکن بے کار ہو گئے تھے میری سرگرمیوں کی وجہ سے میرے میاں کو بھی کام نہیں ملتا تھا۔ غربت کے ہاتھوں ہمیں جڑواں بچوں کا بیڈ تک فروخت کرنا پڑا۔ مجبوراً ہم لندن کے مضافات میں واٹ فورڈ منتقل ہو گئے۔ غربت کے سائے یہاں بھی بدستور چھائے رہے مجھے ہڑتال کے دوران گرفتار کر لیا گیا تھا، اس لیے اب معلّمہ بننے کی بھی مجاز نہیں تھی۔ میرے میاں کا کام یہاں بھی بالکل ٹھپ رہا۔ وہ اس ساری مصیبت کی ذمہ داری مجھ پر ڈالتے تھے۔ اس لیے ان کی رنجش میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ واٹ فورڈ میں چار سالہ قیام کے دوران جو بھی کام ملا میں نے کیا۔ فیکٹری کی کینٹین میں کچن میڈ رہی، سپیرے وومین کے طور پر کام کیا۔ لوگوں کے گھروں میں صفائی وغیرہ کرتی رہی، مٹھائی تیار کرنے کی فیکٹری میں ملازم رہی، حتیٰ کہ چمڑہ رنگنے کے کارخانے میں بھی مزدوری کرتی رہی۔ غربت میرے خاوند کی بیزاری میں اور بھی اضافہ کرتی رہی۔

۱۹۳۰ء کے اوائل میں پارٹی نے مجھے ٹیکسٹائل کے مزدوروں میں کام کرنے کے لیے لنکا شائر بھیج دیا۔ اس زمانے میں ٹیکسٹائل کی صنعت میں بے حساب بے روزگاری پھیلی ہوئی تھی۔ نئی قسم کی ایسی خودکار لومز آ گئی تھیں کہ ایک مزدور کو چار کی بجائے بارہ لومز کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے خلاف احتجاج کی شدید لہر اٹھ رہی تھی۔ مجھے دن رات کام کرنا پڑتا تھا۔ میں نے فیکٹریوں میں جا کر براہ راست کام کے سارے عمل کو سمجھا۔ میری اس عدیم الفرصتی سے میرے خاوند بہت نالاں تھے۔ اگرچہ زبان سے شاذ و نادر ہی وہ کبھی کوئی شکایت کرتے تھے۔

۱۹۳۲ء کا ذکر ہے کہ ایک روز میں کام سے واپس

باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں

مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟

مشرقی پاکستان کے شمالی حصّے پر کمیونسٹوں کا غلبہ ہے

حکومت، ٹاٹگو صدیقی اور ایم اے جلیل میں ٹھن گئی

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ پر بھارت کا قبضہ ہو گیا۔ امریکہ نواز شیخ مجیب نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے استحصالیوں کے چنگل سے نکال کر بھارت کی گود میں ڈال دیا۔ اس میں عوام کی مرضی کا کہاں تک دخل تھا اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی۔

۱۸ر فروری ۱۹۷۲ء کو انتہائی خفیہ طریقہ سے بنگلہ دیش کی کمیونسٹ پارٹی (مارکسسٹ، لیننسٹ) کے چیئرمین محمد طٰہٰ نے ایک پریس کانفرنس میں نام نہاد جدوجہد آزادی کو مسترد کر دیا اور اپنی پارٹی کے کارکنوں پر زور دیا کہ وہ بھارتی توسیع پسندوں کی جدید نو آبادی اور روسی سوشل سامراج کے خلاف جنگ شروع کر دیں۔

کمیونسٹ پارٹی (مارکسی، لیننی) کے اس دھماکہ خیز اعلان نے مجیب، اندرا اور برزنیف ٹولے کو ہلا کر رکھ دیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ کے الفاظ میں طاقت اور آنے والے دنوں کی تیاری کا اعلان تھا۔ مجیب الرحمٰن نے اسلحہ جمع کرانے کی جو اپیل کی تھی اس میں انہیں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بڑی تعداد میں اسلحہ زیرِ زمین پہنچ گیا۔ شیخ مجیب اور اندرا گاندھی اس صورتِ حال سے پریشان ہیں۔ متعدد علاقوں میں باری باری کرفیو لگا کر اسلحہ کی تلاشی کا سلسلہ جاری ہے۔

ایک ماہ بعد ۱۳ر مارچ کو شیخ مجیب نے کھلنا کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا "کمیونسٹوں کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ پولیس شر پسندوں کو جہاں دیکھے گولی مار دے، وہ اپنے آپ کو نکسلی کہتے ہیں مگر بنگلہ دیش میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

شیخ مجیب جن لوگوں سے خوفزدہ ہیں ان کے بارے میں اعلانیہ اظہار کر دیا۔

شیخ مجیب امریکہ نواز ہیں، بنگلہ دیش میں کمیونسٹ تحریک سے خوفزدہ ہیں۔ اندرا گاندھی بھی پریشان ہیں۔ اور روس بنگلہ دیش کے تمام واقعات کو تشویش کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ بنگلہ دیش میں کمیونسٹ تحریک کی موجودہ جدوجہد کو سمجھنے کے لیے اس کا پس منظر دیکھنا ہو گا۔ شیخ مجیب نے فوجی آمر یحییٰ خان سے بار بار اپیل کی کہ "اقتدار ان کے حوالے کیا جائے" ان کی اپیل کے پیچھے یہی خوف لاحق تھا کہ کہیں کمیونسٹ تحریک کے تیز و تند بہاؤ میں ان کی قومی حقوق کی بورژوا تحریک کے پاؤں نہ اکھڑ جائیں۔ انہوں نے یحییٰ خان سے ایک نجی ملاقات میں اس خوف کا اظہار کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں جلد از جلد اقتدار منتقل کر دیا جائے۔

مکتی باہنی کے ایک سینئر افسر نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ نکسلی بنگلہ دیش پر بھارتی اور روسی تسلّط کے سخت خلاف ہیں۔ اب ان کی جدوجہد کا سارا رخ عوامی لیگ، بھارت اور روس کے خلاف ہے۔ چنانچہ ہمارے اندازے کے مطابق تقریباً بیس ہزار اسلحہ جس میں ہلکی مشین گنیں اور مارٹرز بھی شامل ہیں انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا ہے یہ ایک انتہائی محتاط اندازہ ہے۔ بائیں بازو کے پرجوش عناصر نے اسلحہ واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ مجیب واضح طور پر اعلان کر چکے ہیں کہ اسلحہ رکھنے والے سماج دشمن عناصر ہیں۔ کیا یہ ساری باتیں ایک فیصلہ کن جنگ کی طرف اشارہ نہیں کرتیں؟"

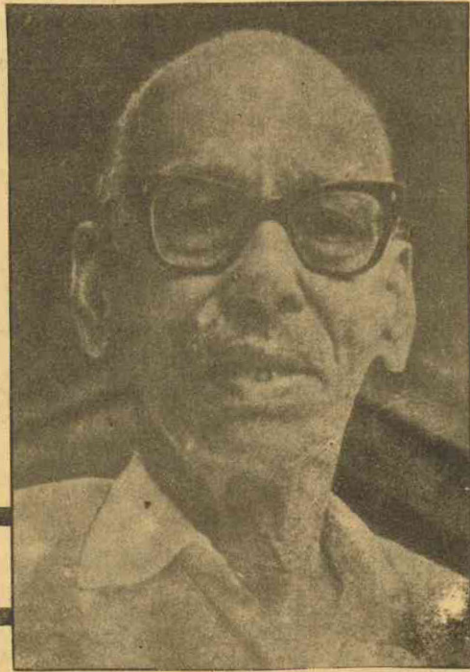
اگر بنگلہ دیش میں کسی دوسرے انقلاب کے امکانات کی راہ ہموار ہو رہی ہے تو یقیناً یہ کمیونسٹ انقلاب ہو گا۔ مجیب کے چھ نکات کی بنیاد پر شروع کی گئی جدوجہد خود مختاری کی جدوجہد تھی اور جسے زبردستی انقلاب کا نام دیا گیا۔ یہ محض مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں اور فوجی جرنیلوں کے استحصال سے نجات کی ایک بورژوا تحریک تھی اس لیے اس کا ڈانڈا بھارتی توسیع پسندوں سے مل گیا۔ بھارت نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اب بنگلہ دیش مغربی پاکستان سے کہیں بڑے بھارتی سرمایہ داروں کے چنگل میں ہے۔ یہ صورتِ حال بنگلہ دیش کے بائیں بازو کے عناصر کے لیے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔

۲۶ر مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی پاکستان کی فوجی جنتا اسے اقتدار میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ مغربی پاکستان کی مسلّح افواج کے مقابلے میں غیر مسلح اور مایوس تھے۔ عوامی لیگ کے رہنما میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے منصوبے کے مطابق سرحد عبور کر کے بھارت فرار ہو گئے۔ اس کے برعکس کمیونسٹ عناصر مشرقی پاکستان میں ڈٹے رہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ نے شیخ مجیب پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا۔ "شیخ مجیب ہمیشہ کی طرح چپکے سے جیل چلا گیا۔ عوامی لیگ کے رہنما ڈر کر بھارت فرار ہو گئے۔ اور عوام کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔"

بھارت کی سرپرستی میں شیخ مجیب کی حکومت عوام کے مسائل حل کرنے میں بری طرح ناکام ثابت ہوئی۔ عوام نے تاریخی قربانیاں دے کر بھی کچھ حاصل نہیں کیا۔ ان کی جھولی پہلے بھی خالی تھی اور اب بھی خالی ہے۔ اس سے بنگلہ دیش میں نئی صورتِ حال جنم لے چکی ہے۔ کمیونسٹ تحریک بتدریج عوام میں مقبول ہوتی جا رہی ہے۔ بنگلہ دیش میں کمیونسٹ عناصر متعدد گروپوں میں تقسیم ہیں جو مسلّح جدوجہد کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کھلنا، چٹاگانگ



پروفیسر مظفر احمد



کامریڈ مونی سنگھ

اور بعض پہاڑی علاقوں پر ان کا مکمل کنٹرول ہے۔ عوامی لیگ یا بھارتی فوج ان علاقوں کا رخ نہیں کرتی۔ شہروں میں اس انقلاب کے لیے عوام کو نفسیاتی طریقے سے تیار کیا جا رہا ہے۔ حالات سازگار ہیں کسی وقت بھی قیامت خیز دھاکہ ہوگا۔

مشرقی پاکستان پر یحییٰ خان کی فوج کشی کے دوران بنگلہ دیش میں کمیونسٹ تحریک کم و بیش چھ گروپوں میں منقسم تھی۔ انفرادی طور پر مونی سنگھ، سراج سکندر اور عبدالمتین اپنے اپنے علاقوں میں مقبول ضرور ہیں مگر ان میں سے کسی رہنما کی پورے ملک میں اتنی مقبولیت نہیں ہے کہ وہ قومی جمہوری انقلاب کی رہنمائی کر سکیں۔

۱۹۵۱ء میں مشرقی پاکستان کے کچھ ترقی پسندوں نے ابتدائی مرحلہ ہی میں اس امر کا فیصلہ کیا کہ "آزادی" سے مشرقی پاکستان کے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ نوآبادیاتی نظام کی جگہ جدید نوآبادیاتی نظام نے حاصل کر لیا۔ پہلے برطانوی سامراج مشرقی پاکستان کی دولت لوٹ رہا تھا۔ اور آزادی کے بعد مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں نے وہ تمام مقام حاصل کر لیا۔ مشرقی پاکستان کے عوام جب تک ہر قسم کے استحصال سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل نہیں کر لیتے، آزادی کا مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ اس فیصلے کے دس سال بعد تک پاکستان سیاسی انتشار کا شکار رہا۔ اس دوران مغربی پاکستان کے اجارہ دار سرمایہ دار دونوں ہاتھوں سے مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کو "لوٹتے" رہے۔ اسی سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھا کر فوج کے ایک سخت گیر آمر ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ایوب آمریت کے دوران سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو گئی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام فوجی آمروں اور سرمایہ داروں کے اس بہیمانہ استحصال سے بلبلا اٹھیں لیکن مشرقی اور مغربی پاکستان کے انقلابی عناصر کے درمیان رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ملک گیر سطح پر کوئی انقلابی تحریک جڑ نہ پکڑ سکی۔ نہ ہی بائیں بازو کا کوئی لیڈر قومی سطح پر ابھر کر سامنے آیا۔ مولانا بھاشانی کسی حد تک اس خلا کو پر کر سکتے تھے مگر نیپ کی اندرونی کشمکش اور مولانا کی تلون مزاجی انہیں قومی سطح پر ابھارنے میں مانع رہی۔

اکتوبر ۱۹۶۷ء میں بنگلہ دیش کی کمیونسٹ پارٹی (مارکسی لینینی) نے "عوامی جمہوریہ مشرقی بنگال" کے قیام کے لیے ایک جامع مبسوط پروگرام تیار کیا اور اس مقصد کے لیے زرعی انقلاب کو منظم کرنے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔ دریں اثنا کمیونسٹ پارٹی نے ایوب آمریت کے خلاف ۶۹/۱۹۶۸ء کے دوران عوامی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا لیکن استحصالی نظام کے خلاف عوامی جدوجہد اس لیے کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی کہ دائیں بازو کی فرقہ پرست اور فاشسٹ پارٹیوں نے ایوب خان سے گٹھ جوڑ کر لیا اور ان کے رہنما ۱۰ مارچ ۱۹۶۹ء کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں سودے بازی کے لیے پہنچ گئے۔ مولانا بھاشانی پارٹی کے دباؤ کی وجہ سے گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے۔ نیپ میں شامل کمیونسٹ عناصر نے ایوب خان کے عام انتخابات کے وعدے کو مسترد کر دیا تھا۔

بھارت کے ایک انگریزی ہفت روزہ "الیسٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا" نے اپنے ایک شمارہ میں انکشاف کیا ہے کہ ——— "اگر بھارت مشرقی پاکستان میں فوج کشی نہ کرتا تو عوامی جدوجہد عوامی لیگ کے ہاتھوں سے نکل کر کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی۔"

غیر ملکی مبصرین کی رپورٹوں کے مطابق اس دوران انقلابی پارٹی بنگلہ دیش کے ایک بڑے علاقے کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ آزاد علاقوں میں کسان کمیٹیاں قائم کر دی گئیں اور زمینیں، بے زمین کسانوں میں مفت تقسیم کر دی گئیں مجیب حکومت کے قیام کے بعد ان میں سے بعض علاقوں پر فوج کے ذریعے دوبارہ قبضہ کر لیا گیا۔ مگر ایسے واقعات چند جگہوں پر ہوئے۔ اب بھی بیشتر علاقوں پر نیکسلی تحریک کی قیادت میں کسانوں کا قبضہ برقرار ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آزاد علاقوں میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

عوامی لیگ اور کمیونسٹ تحریک کے درمیان جنگ چھڑ گئی

بنگلہ دیش میں کمیونسٹ تحریک روز بروز طاقتور ہوتی جا رہی ہے۔ بھارت کی سرپرستی میں مجیب اس تحریک کو کچلنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ رنگ پور، کھلنا اور

...یا

...ی

...قوں کی

...مینیں

...یں

...قسیم

...یتیں

چٹاگانگ کے علاوہ دیگر کئی علاقوں میں جنگ جاری ہے۔ مجیب حکومت نے اخبارات پر کڑی سنسر شپ لگا دی ہے خبروں کی زبردست اسکریننگ کی جارہی ہے۔ عوامی لیگ میں شامل نوجوانوں کا ایک حصہ فاشزم کی راہ پر چل نکلا ہے۔ ٹائمز لندن کے نامہ نگار پیٹر ہنرل ہرسٹ نے تو یہاں تک انکشاف کیا ہے کہ مجیب حکومت اپنے مخالفین کا قتلِ عام کرا رہی ہے۔

بنگلہ دیش میں طلباء کا کردار

بنگلہ دیش کے قیام میں طلباء نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سے سارے طلباء کمیونسٹ نہیں ہیں۔ لیکن وہ مجیب کی ناکامی اور موجودہ صورتِ حال سے سخت ناامید ہیں۔

تانگیل کے ہیرو ٹائیگر صدیقی اور حکومت میں بری طرح ٹھن گئی ہے۔ ایم اے جلیل جس نے مجیب حکومت کے قیام میں بھرپور حصہ لیا۔ اس نے مایوس ہو کر عوامی لیگ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس طرح عوامی لیگ کے وفادار آہستہ آہستہ اس کا ساتھ چھوڑتے جا رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ سُرخ پرچم کے نیچے متحد اور منظم ہو کر عوامی لیگ کی رجعت پسند حکومت کا تختہ الٹنے میں اپنا فرض پورا نہیں کریں گے؟ اس امکان کو اس لیے مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ بنگلہ دیش میں سُرخ پرچم کی مقبولیت میں ہر روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے



اگر دلّی سے ناطہ جوڑنا تھا
تو اسلام آباد کیا بُرا تھا؟

روزانہ پندرہ سے بیس افراد ہلاک کئے جاتے ہیں

ڈھاکہ سے ایک تازہ مکتوب موصول ہُوا ہے۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ یہ مکتوب کس طرح اور کن راستوں سے گزر کر یہاں پہنچا۔ ہم اس خط کے ذریعے قارئین کو "بنگلہ دیش" کی تازہ ترین صورتِ حال سے باخبر کرنا چاہتے ہیں۔ خط کے چند اہم اقتباسات پیشِ خدمت ہیں۔

" یہاں کے بارے میں لکھتے وقت ہاتھ کانپ اٹھتا ہے۔

فوجی حکومت کی ناعاقبت اندیشی، سیاست دانوں کی خود غرضی اور بیرونی طاقتوں کی سازش نے اس سر سبز وادی کو موت اور لہو کے جزیرے میں تبدیل کر دیا ہے۔ غیر بنگالیوں کا خون بہائے بغیر کوئی پروگرام مکمل نہیں ہوتا۔ عوامی لیگ ظلم و بربریت کا جو کھیل کھیل رہی ہے، وہ تاریخ میں سیاہ حروف سے لکھا جائے گا۔ "البدر" اور "الشمس" کے بیشتر رضا کار جنہوں نے بنگالیوں کا خون بہایا تھا بچ گئے یا فرار ہو گئے۔ ان کی سزا ان لوگوں کو دی جا رہی ہے جن کے ہاتھ خون سے بالکل پاک ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے مسلّح رضا کار پیسے یا زیور دے کر بچ گئے یا رشوت دے کر سرحد پار چلے جا رہے ہیں۔ مَیں دو ماہ تین دن جیل میں رہ کر ضمانت پر رہا ہو کر آیا ہوں اور آنے والے دنوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔

عوامی لیگ کی حالت دن بدن خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی ہے۔ کیونکہ عوامی لیگی حکومت یہاں کے حالات کو قابو کرنے میں ناکام رہی۔ ہر طرف اندھیر گردی، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ وغیرہ کا دَور دَورہ ہے۔ سرکاری اعلان کے مطابق صرف مئی سے جون تک ۱۰۴ اسمگلر گرفتار کیے گئے۔ اسمگل کی جانے والی چیزوں میں پٹ سن، مچھلی، ریلیف کی دوائیں، مولی، بانس، ریڈیو، گھڑی، چائے اور چاول شامل ہیں۔ چاول ۸۵ روپے سے ۹۰ روپے من مل رہا ہے۔ اسی طرح آٹا چالیس سے ۴۵ روپے من فروخت ہو رہا ہے۔ مچھلی ایک روپے سیر مل جاتی تھی، اب چار روپے سیر ملتی ہے۔ بیٹری سیل جو دس روپے درجن فروخت ہوا کرتے تھے اب چالیس روپے درجن فروخت ہو رہے ہیں۔ "لائف بوائے صابن" جو صرف دس آنے میں بکتا تھا اب ایک روپے دس آنے میں بیچا جا رہا ہے۔ ایسی صورت میں عوامی لیگ کی پوزیشن خراب نہیں ہوگی تو کیا ہوگی۔ اب تو شیخ مجیب کے خلاف بھی نعرے لگنے لگے ہیں۔ پرسوں ہی چھاترو لیگ کے ایک جلسے میں تصادم ہوتے ہوتے بچا۔ ایک گروپ شیخ مجیب کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ دوسرا گروپ حمایت میں نعرے لگا رہا تھا۔ اب چھاترو لیگ دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک گروپ کو شاہجہاں سراج اور اے ایس ایم عبدالرب لیڈ کر رہے ہیں یہ گروپ سوشلزم کا حامی ہے اور شیخ کا مخالف ہے۔ دوسرے گروپ کو نور عالم صدیقی اور عبدالقدوس ماکھنی لیڈ کر رہے ہیں۔ یہ گروپ شیخ مجیب اور بنگالی قومیت کا حامی ہے۔

طالب علموں کی سیاست میں اس وقت چھاترو یونین (ماسکو نواز) آگے ہے۔ یہ میمن سنگھ زرعی یونیورسٹی کو چھوڑ کر باقی تمام یونیورسٹیوں پر قبضہ کر چکی ہے۔ بلوچی چھاترو یونین اور بنگلہ چھاترو یونین (بھاشانی نواز) نے بھی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس کے بعد چھاترو لیگ (رب سراج) کا نمبر ہے۔ چھاترو لیگ (صدیقی ماکھن) کو پورے صوبے میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ بنگلہ دیش میں چار کمیونسٹ پارٹیاں قائم ہو چکی ہیں ایک موتی سنگھ گروپ (ماسکو نواز) ایک سکدار گروپ، ایک

مارکسٹ اور ایک لیننسٹ۔ مگر اصل کام جو کر رہی ہے وہ کمیونسٹ پارٹی مارکسٹ لیننسٹ یعنی نیکسلائٹ ہے۔ شمالی بنگال تقریباً ان کے ہاتھ میں ہے۔ مٹین آف پٹنہ ایک لڑائی میں بنگلہ دیش رائفلز کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تقریباً دس گھنٹوں تک مقابلہ جاری رہا۔ طلحہ، حق اور علاؤالدین محفوظ ہیں اور اپنا کام بڑی تیزی سے کر رہے ہیں۔ پورے صوبے میں روزانہ تقریباً پندرہ سے بیس افراد ہلاک کیے جاتے ہیں۔ ان میں سرمایہ دار، زمیندار، عوامی لیگ ماسکو نواز نیپ اور ماسکو نواز کمیونسٹ پارٹی کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔

مولانا بھاشانی کی وہی پرانی عادت ہے۔ اہم موقعوں پر بیمار پڑ جانا اور حکومت کے پیچھے لگا رہنا!! آج کل مولانا نے سنتوش سے ایک ہفت روزہ اخبار نکال لیا ہے اس کا نام "حق کوتھا" ہے۔ اس میں حکومت کو خوب لتھاڑتے ہیں۔ چند دن ہوئے اس کے ایڈیٹر عرفان الباری کو گرفتار کر لیا گیا۔

سچ پوچھو تو عوامی لیگ کی حکومت اس اخبار سے سخت خائف ہے۔ آج کل مولانا خود اس کو ایڈٹ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ "ہالی ڈے" بھی حکومت کے مخالف کیمپ میں موجود ہے۔ "ہالی ڈے" بڑی بے جگری سے تنقید کر رہا ہے۔ اس نے صاف لکھ دیا ہے: "اگر دلی سے ناطہ جوڑنا تھا تو اسلام آباد کیا برا تھا۔ آخر ہماری آزادی کہاں گئی؟" اخبار اس بات پر زبردست تنقید کر رہا ہے کہ قانون کے وزیر ہوں یا امور خارجہ کی منصوبہ بندی کے وزیر یا داخلی امور کے وزیر، سب کے سب دلی کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ طلحہ کے اخبار "گنو شکتی" کو حکومت نے بند کر دیا اور اس کے مدیر کو گرفتار کر لیا گیا۔ مجموعی طور پر صوبے کی سیاسی، معاشی اور اخلاقی حالات انتہائی خراب ہیں۔

شملہ کانفرنس پاکستان کی سیاسی فتح ضرور ہے لیکن دیگر مسئلوں کا حل نہیں۔ ایک فیصلہ کن جنگ ضرور ہوگی۔ تمہارے یہاں سے بڑی بری خبریں آ رہی ہیں سنا ہے کہ سندھی اردو کی آگ میں پورا سندھ جل رہا ہے۔ تمہارا کیا حال ہے؟ سخت تشویش ہے اس کے بارے میں لکھو!!

بقیہ: مسز روز اسمتھ

آئی تو یہ تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ انہوں نے میرے تمام کاغذات وغیرہ جلا کر اپنا دکھ ظاہر کیا ہے۔ اس مرحلہ پر ہم دونوں نے محسوس کر لیا کہ یہ سفر اکٹھے نہیں کٹ سکتا سو علیحدگی ہوگئی۔ دونوں بچوں کی پرورش کی ذمہ داری مجھ پر رہی۔ میں بتا چکی ہوں کہ میرے خاوند صرف اپنی ہی ذات سے محبت رکھتے تھے یا پھر اپنے کام سے!

س:۔ مسز اسمتھ، میری درخواست ہے کہ جب سے اب تک کے خطِ وقت پر اپنی موٹی موٹی مصروفیات کی مختصراً نشاندہی کر دیں۔

ج:۔ پارٹی کا خیال تھا کہ میں نشر و اشاعت کے کام کے لیے زیادہ موزوں ہوں۔ چنانچہ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے پہلے ہی مجھے پارٹی کے اخبار "دی ڈیلی ورکر" میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ میں نے اس اخبار میں اکیس سال تک رپورٹنگ کی۔ قریب قریب شعبۂ زندگی کے بارے میں رپورٹنگ کا تجربہ حاصل کیا۔ کام کی لگن کا یہ عالم تھا کہ مسلسل دس برس تک ایک دن کی بھی چھٹی نہیں لی۔ آخری دور میں اخبار کی پالیسی سے مطمئن نہیں رہی تھی اس لیے چونسٹھ سال کی عمر میں مستعفی ہو کر پھر کان کنوں میں کام کرنے لگی۔ ۶۸ سال کی عمر میں اپنے بیٹے کے پاس آسٹریلیا چلی گئی۔ واپس برطانیہ پہنچی تو ۱۹۶۲ء میں پارٹی نے مجھے چین بھجوا دیا۔ اس وقت میری عمر اکہتر ۷۱ سال تھی۔ پہلے میں سیکشن میں کام کیا پھر چائنا ری کنسٹرکشن میں کام کیا اور آج کل سنہوا نیوز ایجنسی میں کام کر رہی ہوں۔

(باقی آئندہ)



یوسف عزیز زاہد

آدھی لاش کی قبر

میں صدیوں سے سوچ کی صلیب پر لٹکا اپنی لاش کا ماتم کر رہا ہوں اور میری بے کفن لاش جیون کے چوراہے پر لٹکی دھرتی میں تعفن پھیلا رہی ہے۔ اس چوراہے سے بہت دور پیلے چہروں والے مریل لوگ جن کے جسموں پر غبار آلود کپڑے ہیں اور جن کے زخموں سے خون بہہ رہا ہے، میری لاش کو جیون کے چوراہے پر لٹکا دیکھ کر رو رہے ہیں۔ شائد وہ میری لاش کے گرد طواف کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میری لاش کے گرد چند لوگوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ یہ لوگ جن کے جسموں پر بھڑکیلا لباس ہے اور جن کے چہرے نقابوں میں چھپے ہیں، میری لاش کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔۔۔ مگر میں چاہتا ہوں وہ لوگ جو دور کھڑے رو رہے ہیں۔ مجھے اپنی حفاظت میں لے لیں۔ میرے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ اور بھڑکیلے لباس والے لوگ چلا رہے ہیں۔

"ہم تمہارے محافظ ہیں۔۔۔ وہ دور کھڑے ہوئے لوگ بھوکے ہیں اور تمہاری لاش نوچ کر کھانا چاہتے ہیں۔"

میں اپنے جسم کا خول توڑ کر ان کے ذہنوں میں گھس جاتا ہوں۔

ان لوگوں کی سوچ کتنی مکروہ ہے۔ یہ بھڑکیلے کپڑوں والے لوگ سوچ رہے ہیں کہ میری لاش ان کے لئے بڑی ضروری ہے۔ اگر میری لاش بوسیدہ کپڑوں والے مریل لوگ اٹھا کر لے گئے تو ان خوبصورت چہروں کی نقابیں بچ جائیں گی اور ان کے چہرے ان کی سوچوں کی مانند مکروہ ہو جائیں گے۔ میں سب لوگوں کے ذہنوں کو ٹٹولتا ہوں۔ مگر وہی مکروہ سوچیں بدبودار ذہن۔!

پھر میں ان لوگوں سے نکل کر مریل لوگوں کے ہجوم میں داخل ہوتا ہوں۔ یہ لوگ مجبوریوں کے جال میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کو مخاطب کرتا ہوں مگر یہ لوگ میری بات نہیں سن سکتے۔ میں انہیں جھنجھوڑتا ہوں مگر ان کا احساس ہی مر چکا ہے۔ میں چیختا ہوں، مجھے پہچانو، مگر ان کی بینائی گم ہے۔

ان کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو ہیں۔ ان کی زبانیں پیاس اور بھوک سے سوکھ چکی ہیں۔ اور ان کے احساس کو مجبوریوں کا دیمک چاٹ چکا ہے۔ پھر میں ان کے ذہنوں میں جھانکتا ہوں۔

کتنے منجمد ہیں ان کے ذہن ۔؟ اور ان کی سوچیں بالکل منتشر ہیں۔

"جاگو۔۔۔ بے بس لوگو۔ جاگو" اور میری لاش کو نوچ کر اپنی بھوک مٹاؤ کہ میری لاش تم ہی نے اپنی بھوک مٹانے اور اپنے جسم ڈھانپنے کے لئے حاصل کی تھی اور اب اس پر کسی اور کا قبضہ ہے۔ اٹھو۔ تم مرے تو نہیں۔ زندہ ہو۔ میں چیختا ہوں اور مریل جسم کانپنے لگتے ہیں۔ اور میری لاش کی طرف دیکھ کر آنسو بہانے لگتے ہیں۔

میں پھر چلاتا ہوں۔ تمہاری امانت غیروں کے قبضے میں ہے۔ اور وہ اسے اپنی ملکیت سمجھ رہے ہیں۔ چھین لو اپنی امانت چھین لو۔ میں انہیں جھنجھوڑتا ہوں اور ان کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ مجبوریوں کے جال کی گرہیں کاٹ دیتے ہیں تب میں اپنے جسم کے خول میں واپس چلا جاتا ہوں۔

بھڑکیلے لباس والے میری لاش کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ شائد مفنانے ۔؟

مجھے پھر ان مریل لوگوں پر غصہ آ رہا ہے۔ وہ پھر دھوکے میں آ گئے ہیں اور میری لاش کا ماتم کرنے لگے ہیں۔

بھڑکیلے لباس والوں نے میرا تابوت اٹھا لیا ہے اور وہ مجھے دفن کرنے لے جا رہے ہیں۔ ان کے مصنوعی چہروں پر آنسوؤں کے قطرے ہیں اور یہ لوگ بھی میری موت کا ماتم کر رہے ہیں۔ میں پھر اپنے جسم کا خول توڑ کر باہر آتا ہوں اور ان لوگوں کے ذہن ٹٹولتا ہوں۔

ہاں۔۔۔ یہی لوگ میرے قاتل ہیں اور میرا جنازہ اٹھا کر خوش ہیں کہ اس طرح وہ الزام سے بچ جائیں گے۔ ان کے باطن میں۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ سیاہی، تاریکی۔ مگر انہوں نے اپنے چہروں پر تقدس کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے یہی وہ لوگ ہیں جو اچھائیوں کی تقسیم کرتے ہیں کہ ان کا ہر فعل اچھائی ہے اور یہی لوگ ثواب اور گناہ کے ٹھیکیدار ہیں کہ ان کے نزدیک ان کے اعمال صالح ہیں۔ اور یہی لوگ میرے پجاری بن بیٹھے ہیں۔

لیکن بوسیدہ جسموں والے لوگ ان کے چہروں پر مصنوعی تقدس کو نہیں پڑھ سکتے کہ ان کی سوچوں پر بھوک نے تالے لگا رکھے ہیں اور اُن کے بڑے بھی یہی کہتے تھے۔ کہ ایسا کرنا گناہ ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ اب وہ لوگ بہت دور رہ گئے ہیں اتنی دور کہ اب انہیں میرا جنازہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ بھڑکیلے کپڑوں والے لوگ مجھے گندگی کے ڈھیر میں دفن کر رہے ہیں۔ مگر میں اپنے وجود میں موجود نہیں اور میری لاش بھی گل سڑ کر آدھی رہ چکی ہے۔!

میں ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر ان لوگوں کو دیکھنے لگتا ہوں یہ لوگ میری لاش گندگی کے ڈھیر میں دفن کر چکے ہیں اور اب میری قبر پر پھول سجا رہے ہیں ان کی عقل پر قہقہے لگاتا ہوں اور وہ خوفزدہ ہو کر چاروں طرف مجھے تلاش کرتے ہیں۔ ان کے چہرے خوف سے بگڑنے لگتے ہیں۔ اور وہ اپنے چہرے رومالوں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ قبر پر شمعیں

لوبان، اور مٹی کے چراغ جل رہے ہیں۔ موتیے اور گلاب کے پھول بکھرے ہیں۔ میرے قہقہے تیز تر ہو جاتے ہیں اور یہ لوگ خوف آلود مکروہ چہرے ڈھانپے ہوئے یہاں سے بھاگ جاتے ہیں اور میرا وجود..... مجھے دوبارہ مل جاتا ہے میں حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہوں ہر طرف ویرانے اور سناٹے کی حکمرانی ہے اور سامنے گندگی کے ڈھیر میں میری لاش دفن ہے۔ آدھی لاش۔

میں ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا اپنی قبر کے نزدیک بیٹھ جاتا ہوں۔ لوبان، گلاب اور موتیے کی خوشبو کے ساتھ اٹھتا ہوا تعفن۔ عجیب سی بے چینی میرے سارے جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔ میں پھولوں کو مسل دیتا ہوں شمعیں، لوبان اور چراغ بجھا دیتا ہوں۔ اور قریب پڑے ہوئے نوکیلے پتھروں سے قبر کی مٹی ہٹانے لگتا ہوں۔

پھر نہ جانے وہ بوسیدہ کپڑوں والے لوگ کہاں سے آ جاتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں۔

تم یہ قبر کیوں کھود رہے ہو۔؟

اس میں میری لاش دفن ہے۔

تمہاری لاش.... ؟ وہ سب حیرت سے چیخ اٹھتے ہیں۔ مگر تم تو ابھی تک زندہ ہو۔ ان سب کی آوازیں خوف سے کانپ رہی ہیں۔ میں مڑ کر ان کے چہروں کو تکنے لگتا ہوں۔ بھوک.... بے بسی، مجبوریاں، کتنی ہی داستانیں۔ ان پیلے چہروں اور دھنسی ہوئی آنکھوں میں پوشیدہ ہیں۔

کیا تم بھوک سے نجات پانا چاہتے ہو۔؟

ہاں۔ میرے سوال کے جواب میں وہ یک زبان ہو کر کہتے ہیں۔

"تو آؤ اس قبر کو کھود دیں۔ اس میں ہم سب کی بھوک دفن ہے، میرے ساتھ وہ بھی قبر کی مٹی ہٹانے لگتے ہیں۔

گندگی کے ڈھیر میں سے ایک لاش نکلتی ہے۔ گلی سڑی آدھی لاش۔ اور میں ایک بار پھر لاش میں تحلیل ہو جاتا ہوں۔ تب وہ لوگ چاروں طرف مجھے تلاش کرتے ہیں اور میری لاش کا ماتم کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ تب آخری بار میں انہیں پکارتا ہوں۔

بے بس لوگو.... میری لاش اٹھا کر کہیں دور لے چلو کہ بھڑکیلے کپڑوں والے تمہاری تاک میں بیٹھے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس آدھی لاش کو بھی نوچ جائیں۔

"اٹھاؤ میری لاش کہ تم ہی میرے سچے محافظ ہو اور میں تمہارا پیٹ بھوک سے پچکے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔"

اور وہ مریل جسموں والے میری لاش اٹھا کر ویرانوں کی طرف چل دیتے ہیں۔

الفتح



تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے "مجرم" عوامی عدالت میں

جموں و کشمیر قومی محاذ آزادی کے رہنما اور "گنگا" ہائی جیکنگ کیس میں ملوّث کشمیری حریت پسند جناب مقبول احمد بٹ کے عدالتی بیان کے اقتباسات نذر قارئین ہیں۔ (ادارہ)

حکمرانوں نے ہمیشہ مسئلہ کشمیر کو اپنی ہوسِ اقتدار کیلئے استعمال کیا

اسے سوءِ اتفاق کہیے یا حالات کی ستم ظریفی مجھے اس خاص عدالت کے سامنے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا ہے اور ایک خاص حکم کے تحت مجھ پر چند ایسے الزامات کے تحت مقدمہ چلایا جا رہا ہے جو نہ صرف بے بنیاد اور حقیقت سے بعید ہیں بلکہ اگر انہیں میرے وطن کی آزادی کے دشمنوں کے ذہن کی اختراع اور جموں و کشمیر کے معروف جدوجہد عوام کے ساتھ ایک ظالمانہ مذاق قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مجھے اور میرے ساتھیوں کو ملزموں کی صف میں کھڑا کرنے والے پاکستان کے خود ساختہ حکمرانوں اور ان حالات و کوائف سے متعلق جن کے تحت یہ مقدمہ "معرضِ وجود" میں لایا گیا، تاریخ اپنا فیصلہ صادر کر چکی ہے۔ تاریخ کا یہ فیصلہ اس قدر واضح ہے کہ اس پر مزید روشنی ڈالنے یا اس کی توضیح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

مَیں نے یقیناً نہ تو خود کوئی سازش تیار کی اور نہ ہی سازشیوں کے کسی گروہ میں شامل رہا ہوں۔ میرا کردار ہمیشہ واضح اور غیر مبہم رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ فرسودگی دولت پسندی استحصال ظلم اور غلامی، منافقت کے خلاف بغاوت کا مرتکب ہُوا ہوں۔ استعماری نظام کا پروردہ پاکستانی حکمران طبقہ جس کی نمائندگی اس ملک کی نوکر شاہی اور فوجی آمریت انجام دیتی رہی ہے۔ اگر اسے "سازش" قرار دے تو مجھے یہ الزام درست تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں!!

میرے نزدیک یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ تاریخ کے ہر دَور میں استحصال اور غلامی کے خلاف جب بھی کوئی تحریک شروع کی گئی اسے دبانے کے لیے اقتدار و اختیار پر قابض روائتی حکمرانوں نے ہمیشہ قانون کی لعنت کے اس لفظ جسے "سازش" کے نام سے پکارا جاتا ہے، کا سہارا لیا ہے۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ ظالم اور مظلوم کی جنگ میں مآل کار فتح مظلوم کی ہوتی ہے اور ظلم کی عمارت مظلوم عوام کی انقلابی جدوجہد کے مقابلے میں دھڑام سے زمین بوس ہوتی ہے۔

مَیں اس معزز عدالت کے نوٹس میں یہ بات لائے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گو اس مقدمہ میں بظاہر صرف چھ اشخاص کو ملوّث کیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تمام کارروائی کا اصل مقصد ہماری تحریکِ حریت کو کچلنا اور اس کے مدعیوں کے راستے میں شدید قسم کی رکاوٹیں کھڑی کر کے انہیں راہِ عمل کو ترک کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ پاکستان کی نوکر شاہی کے "مقدمہ ساز دماغوں" کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس امر سے قطع نظر کہ اس مقدمہ کے انجام کے طور پر میرے اور میرے ساتھیوں کا مقدر خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو جس اصل مقصد کو وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں سوائے رسوائی اور ناکامی کے انہیں اور کچھ نہیں ملے گا۔

انسانی فلاح اور آزادی کی تحریکوں سے متعلق فیصلے مروجہ عدالتوں میں نہیں بلکہ خود تاریخ کے ارتقائی عمل کی عدالت میں کیے جاتے ہیں اس لیے کہ مروجہ عدالتیں بذاتِ خود اس نظام کی مرہون ہوتی ہیں جسے بدلنے کے لیے تحریکیں جنم لیتی اور پروان چڑھتی ہیں۔

میرے وطن اور اس میں بسنے والے نصف کروڑ کے لگ بھگ عوام کی آزادی کے خلاف آج تک جو سازشیں ہوئی ہیں ان کا تفصیلی جائزہ اس مختصر سے بیان میں سما نہیں سکتا۔ بہر حال ان سازشوں کے اس پہلو کو نمایاں کرنا ضروری ہے جس کے نتیجہ میں یہ مقدمہ عدم سے وجود میں لایا گیا۔

کشمیری عوام کے خلاف سازش کا یہ پہلو ہمارے اعلانیہ دشمنوں نے نہیں بلکہ ان کے کوتاہ اندیش اور بدخواہ "دوستوں" نے ترتیب دیا ہے جنہوں نے اس بدقسمت ملک کی قیادت پر اوچھے طریقوں سے قبضہ کر کے نہ صرف اس میں بسنے والے تیرہ کروڑ انسانوں کو طویل عرصے تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھا بلکہ اپنی بساطِ اقتدار کو سہارا دینے کے سازشی عمل میں اس کے وجود کو ہی داؤ پر لگا دیا۔ ظاہر ہے ایسی قیادت جو خود اپنے عوام سے دشمنی اور غداری کی مرتکب ہوئی ہے۔ ایک ایسی قوم کی دوست اور خیر خواہ کیونکر ثابت ہو سکتی جو ہنوز غلامی سے چھٹکارا پانے کے لیے معروفِ جنگ ہو۔ مجھے یہ بات کہنے سے نہیں روک سکتا کہ پاکستان کی برسرِ اقتدار قیادت نے گزشتہ ۲۵ برس کے دوران ہر مرحلے پر "آزادیٔ کشمیر" کے مسئلے کو اپنی ہوسِ اقتدار کے مقصد کے لیے ایکسپلائٹ کیا اور ملک کے کروڑوں عوام جنہیں کشمیر کی آزادی سے سچی لگن تھی اور اب بھی ہے، کے معصوم جذبات کا سہارا لے کر اپنی غیر مخلص قیادت کا سنگھاسن قائم رکھنے کے لیے اس مسئلے کو ناجائز طور پر استعمال کیا جب زمامِ اقتدار فوجی آمریت کے ہاتھوں میں آگئی تو اس سازش نے مزید بھیانک روپ دھار لیا۔ اور اس کے منطقی انجام کے طور پر نہ صرف پاکستان اپنا اصل وجود کھو بیٹھا۔ بلکہ عملاً ہماری تحریکِ آزادی اگر صدیوں نہیں تو برسوں پیچھے ضرور چلی گئی۔

یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ روزِ اوّل سے ہی ہماری تحریک اور اس ملک کی حکمران نوکر شاہی اور فوجی آمریت کے

درمیان ایک قسم کا ٹکراؤ پیدا ہوا۔ اس ٹکراؤ کا بنیادی سبب مقاصد اور طریقِ کار کا اختلاف ہے۔ ہم نے اپنے وطن کی آزادی کے لیے مسلح جد وجہد کا جو نظریہ پیش کیا اس ملک کے فوجی حکمرانوں نے محض بدنیتی کے باعث اسے کبھی پسند نہیں کیا۔ نہ صرف یہ کہ اس کو پسند نہیں کیا بلکہ اس نظریے کی بنیاد پر کسی عملی تحریک کے ابھرنے میں ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کردیں۔ یہ سلسلہ اس قدر طویل ہے کہ اس پر واقعات کی روشنی میں ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں تاہم یہ نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی کہ مقاصد اور طریقۂ کار کے اس اختلاف کو بنیاد بنا کر ہمیں وطن دشمن قرار دیئے جانے کا فیصلہ فوجی حکمرانوں نے عین اس وقت کیا جبکہ وہ اپنے ناجائز اقتدار کو سہارا دینے اور اس ملک پر فوجی آمریت کا سیاہ رات کو طول دینے کی مجرمانہ کوشش کے سلسلے میں ایک سازشی ڈرامہ کا آخری سین تیار کر رہے تھے۔ یہ فروری ۱۹۷۱ء کا آخری ہفتہ تھا اور راولپنڈی کے "ایوانِ صدر" پر قابض فوجی آمروں کا ٹولہ پاکستان کے تیرہ کروڑ عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی روکنے کے لیے اپنے منصوبے تیار کرنے میں مصروف تھا

اپنی تاسیس سے لے کر ۲۴ فروری ۱۹۷۱ء تک این۔ ایل۔ الیف کے بارے میں حکمرانوں کے کسی بھی حلقے کی جانب سے نہ تو کسی قسم کے شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا تھا اور نہ ہی اس کی کارروائیوں جن میں گنگا کی ہائی جیکنگ کا واقعہ بھی شامل تھا، کے متعلق یہ باور کرنے کی کوئی وجہ موجود تھی کہ ان کے پیچھے کوئی خفیہ مقصد کارفرما ہے۔ تاہم محولہ بالا سازش کی تکمیل کے لیے حکمران ٹولے نے این۔ ایل۔ الیف اور ہائی جیکنگ کے واقعہ کو اپنے عوام دشمن اور جمہوریت کش منصوبوں کا جواز پیدا کرنے کی خاطر چند غیر حقیقی اور بے بنیاد اسباب کے سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۲۴ فروری ۱۹۷۱ء کو ہی ایوانِ صدر راولپنڈی سے اس سلسلے میں اولین ہدایات جاری کردی گئیں۔ انٹر سروسز انٹیلی جنس بیورو کو حکم دیا گیا کہ وہ ہائی جیکنگ کے واقعہ کی تحقیقات کرے۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی گئی کہ حریت پسندوں کو عوام اور پریس سے دور رکھا جائے اور انہیں کسی خاموش مقام پر منتقل کیا جائے۔ جب ہم نے اس ہدایت کے پس منظر کے بارے میں دریافت کیا تو ہمیں بتایا گیا کہ "ملک ایک نازک سیاسی بحران سے گزر رہا ہے اور شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ آئینی امور کے بارے میں جو آویزش شروع ہوئی ہے، اسے حل کرنے کے لیے مغربی پاکستان میں سازگار ماحول پیدا کرنے کی غرض سے فی الحال کشمیر کے بارے میں عوام کے جذبات کو ٹھنڈا رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں سمجھایا گیا کہ شیخ مجیب چونکہ ہندستان سے دوستی کے خواہشمند ہیں اس لیے وہ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ کسی بھی معاملے پر فی الوقت ہندوستان کے ساتھ کنفنڈریشن کو ہوا دی جائے۔ محض اس جذبے کے تحت کہ مبادا ہماری تحریک کے باعث پاکستان کا آئینی بحران سنگین صورت نہ اختیار کر جائے اور یوں ہماری نیت کے بارے میں شکوک پیدا نہ ہوجائیں ہم نے اس سلسلے میں تعاون کیا اور حریت پسندوں کو راولپنڈی سے ٹانڈہ ڈیم منتقل کیے جانے پر رضامند ہوگئے۔

چند ہی روز بعد ایوانِ صدر سے قومی اسمبلی کے مجوزہ اجلاس کے التوا کا اعلان کیا گیا۔ اور یوں ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ملک کے درپیش آئینی بحران کی شدت میں اضافہ کیا گیا۔ سابق فوجی آمر نے اس اعلان کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں جو المناک واقعات پیش آئے انہیں برپا کرنے کا منصوبہ پہلے سے طے کیا جا چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شیخ مجیب کو راولپنڈی آکر سابق صدر سے مذاکرات کی دعوت دی گئی۔ اور جب اس نے یہ دعوت قبول کرنے سے انکار کردیا تو مارچ ۱۹۷۱ء کے دوسرے ہفتہ میں ایوانِ صدر سے ایک اور اعلان جاری ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ سابق صدر شیخ مجیب سے مذاکرات کے لیے ڈھاکہ جانے والے ہیں۔ یحییٰ خان کی ڈھاکہ روانگی سے ایک روز قبل وزارتِ خارجہ کے ایک ترجمان نے اعلان کیا کہ ہائی جیکنگ کے واقعہ کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے گی۔ عدالتی تحقیقات کے اس فیصلے کے بارے میں جب ہم نے حکومتِ پاکستان کے متعلقہ حکام سے وضاحت چاہی تو ہمیں بتایا گیا کہ یحییٰ مجیب مذاکرات میں ہائی جیکنگ کے واقعہ پر گفتگو لازماً ہوگی اور شیخ صاحب جہاز کے جلائے جانے کے بارے میں تحقیقات کا مطالبہ کر چکے ہیں۔ اس لیے اس اعلان سے ڈھاکہ مذاکرات میں تلخی کا ایک پہلو ختم ہوجائے گا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے خلاف دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے اور بین الاقوامی شہری ہوابازی کی تنظیم کے مطالبے کو پورا کرنے کے لیے ایک سرسری سی تحقیقات ضروری ہوگئی ہے تاکہ عالمی سطح پر اس واقعہ میں پاکستان کے ملوث نہ ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا جاسکے۔ ہمیں یہاں تک بتایا گیا کہ اگر ضرورت محسوس کی گئی تو

غدّار کون ہے؟ اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی

کمیشن قائم کیا جائے گا ورنہ شاید اس کی نوبت بھی نہ آئے۔ ۲۰ر مارچ ۱۹۷۱ء کو عین اس وقت جب کہ ڈھاکہ میں یحییٰ مجیب مذاکرات فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو چکے تھے۔ اور فوجی حکمرانوں نے اپنی سازش کی بساط بچھا دی تھی اور صرف موزوں وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ مرکزی حکومت نے کمیشن کے قیام کا اعلان کر دیا۔ کمیشن کی شرائط منصوبہ کو جان بوجھ خفیہ رکھا گیا اور متعلقہ حکام برابر یہی تاثر دیتے رہے کہ کمشن محض ایک (EYE WASH) ہے۔ ۲۵ر مارچ ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان کے اصل عزائم بے نقاب ہو کر سامنے آگئے اور مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی شروع کر دی گئی۔ اس کے ٹھیک دو روز بعد ۲۷ر مارچ ۱۹۷۱ء کو تحقیقاتی کمیشن نے بھی کام شروع کر دیا۔ کمیشن میں شامل دو ارکان حکومت کے شعبہ ہائے سراغرسانی سے تعلق رکھتے تھے۔ جبکہ تیسرے رکن مسٹر راحت سعید چھتاری وزارتِ خارجہ کے نمائندے تھے۔ یہ وہی مسٹر چھتاری ہیں جن کو اس ملک کی پہلی عوامی حکومت نے شدید بدعنوانیوں کے الزام کی بناء پر ملازمت سے برطرف کر دیا ہے۔

واقعات کا یہ تسلسل ظاہر کرتا ہے مجھے اور میرے دوسرے ساتھیوں کے خلاف اس مقدمہ کے سلسلے میں جو کارروائی کی گئی۔ اس کے پیچھے ایک خاص مقصد کارفرما تھا۔ یہ مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ فوجی حکمران ٹولے نے مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کر کے ملک کو جس شدید خانہ جنگی سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کے لیے اپنی مرضی کے مطابق علاوہ دیگر اسباب کے ایک اور جواز پیدا کیا جائے۔ تحقیقاتی کمیشن نے حکمرانوں کی خواہش کے مطابق ایک رپورٹ مرتب کر کے یہ مقصد پورا کر دیا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کمیشن کی رپورٹ صدر کو پیش کیے جانے سے چھ روز قبل یعنی ۱۴ر اپریل کو ہی مجھے میرے دیگر کئی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور کمیشن کی رپورٹ کے منظرِ عام پر لائے جانے کے بعد ہماری تحریک کو ختم کرنے کے لیے دار و گیر کا جو سلسلہ شروع کیا گیا اس کے تصوّر سے وحشت ہوتی ہے۔

زندگی کے اس دور میں جو میں نے اپنے وطن کی جنگ آزادی میں گزارا ہے مجھے نہایت ہی کٹھن اور صبر آزما امتحانوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ایسے مراحل بھی آئے۔ جب نہ صرف یہ کہ کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں تھا بلکہ خود اپنی صلاحیتیں بھی جواب دے دیتی تھیں۔

مجھے ذاتی طور پر تشدد کے تین ادوار سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ دورِ اسیری کے ان ایام پر مشتمل ہیں جن میں مجھے مقبوضہ کشمیر کے قابض حکام آزاد کشمیر میں متعین الف۔ آئی۔ یو کے گیسٹاپو قسم کے فوجی افسروں اور آخر میں لاہور کے رسوائے زمانہ اور دورِ غلامی کی یادگار شاہی قلعہ کے پولیس افسروں سے پوچھ گچھ اور تحقیقات کے دوران واسطہ پڑا ہے۔ ان میں سے تشدد کے ہر دور کی داستان اس قدر طویل ہے کہ ان کی تفاصیل کے بیان کرنے کی اس بیان میں گنجائش ہی نہیں البتہ ایک بنیادی حقیقت جس کا ذکر یہاں بے محل نہ ہو گا یہ ہے کہ تینوں مقامات پر مجھ پر کئے جانیوالے تشدد کے مقاصد بالکل مختلف تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں مجھ پر اس لئے تشدد کیا گیا کہ قابض حکام میری ذات اور تحریک کے بارے میں حقائق کی تلاش میں تھے۔ مظفر آباد کے الف۔ آئی۔ یو (F.I.U) والوں کو حقائق کی تلاش تو نہ تھی البتہ وہ اپنے پہلے سے قائم کئے ہوئے مفروضات کے بارے میں مجھ سے تائیدی شہادت حاصل کرنا چاہتے تھے اور شاہی قلعہ لاہور کے "گسٹاپو" مجھ سے صریح جھوٹ کہلوانا چاہتے تھے اور ایک طے شدہ سازشی منصوبے کی تکمیل کے لئے مجھ سے اپنی مرضی کے مطابق بیان دلوانا چاہتے تھے۔ یہ بات بھی اس ملک کے غاصب حکمران ٹولے کو ہی زیب دیتی تھی کہ اُس کی انتظامی مشینری حقائق کو توڑ مروڑ کر خود ساختہ افسانوں کے لئے کردار گھڑنے کی مجرمانہ سعی میں بھی انسانیت سوز وحشت و بربریت کا مظاہرہ کرتی۔ اور ظلم و سفاکی کے اس عمل میں اس حد تک جا پہنچی۔ جہاں انسان کو اس کے ضمیر سے ہی محروم کیا جاتا ہے۔ لاہور کے شاہی قلعہ میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو جس بہیمانہ تشدد کا شکار بنایا گیا اس کی چند تفاصیل میرے دیگر ساتھیوں نے اپنے تحریری بیانات میں درج کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی شاہی قلعہ میں بہت کچھ ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ بعض تفاصیل اس قدر شرمناک ہیں کہ انہیں ضبطِ تحریر میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ استغاثہ نے میرے خلاف اپنے من گھڑت الزامات ثابت کرنے کے لئے فرضی واقعات کا جو تانا بانا تیار کیا ہے ان کی حقیقت منظرِ عام پر لانے کے لئے میں موجودہ حالات میں کوئی صفائی پیش نہیں کر سکتا۔ فرضی واقعات کی یہ کہانی اگرچہ بجائے خود الف لیلیٰ کی داستانوں سے بھی زیادہ افسانوی ہے تاہم استغاثہ کو اچھی طرح سے یہ معلوم تھا کہ میرے خلاف جو الزامات عائد کئے گئے ہیں ان کی حقیقت اُس وقت تک منکشف نہیں ہو سکتی جب تک میرا وطن جنگ بندی کی منحوس لکیر کے باعث دو ناقابل عبور حصّوں میں منقسم رہے گا۔ تاہم مجھے کامل یقین ہے کہ میرے وطن کے افق پر آزادی کا حقیقی سورج طلوع ہو کر رہے گا اور ہمارے دلوں پر کھینچی گئی یہ منحوس لکیر بٹ کر رہے گی جس وقت یہ صورتِ حال پیدا ہو گی تو میرے کردار کے بارے میں اصل حقائق منظرِ عام پر آ کر رہیں گے۔ میرے ساتھ صرف اس وقت انصاف ہو گا۔ یہ انصاف کشمیر کی تاریخ کی عدالت میں ہو گا۔ مجھ پر عائد کیا جانے والا ہندوستانی قابض حکام کا یہ الزام بھی غلط ثابت ہو گا کہ میں نے پاکستانی ایجنٹ بن کر مقبوضہ کشمیر میں حکومت کا تختہ اُلٹنے کی مجرمانہ سازش کی تکمیل کے لئے وہاں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کیا اور پاکستانی نوکر شاہوں کا یہ الزام بھی بے بنیاد ثابت ہو گا کہ میں نے ہندوستانی ایجنٹ بن کر ہائی جیکنگ جیسا حریت پسندانہ آپریشن کرایا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ پاکستان کے فوجی سراغرساں اداروں کے ریکارڈ میں ہر اس شخص کو سیاہ (Black) قرار دیا جاتا رہا جو اس ملک پر مسلط فوجی آمروں کی پالیسیوں اور طرزِ عمل سے اختلاف جیسے "جرم" کا مرتکب ہوا۔ بلکہ ہر وہ شخص غدار اور دشمن کا ایجنٹ قرار دیا جاتا رہا جو قومی معاملات میں حکمران ٹولے کی منشا اور مرضی سے ہٹ کر کسی دوسرے لائحہ عمل پر چل پڑا۔ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فوجی آمروں نے دنیا کے کسی بھی حصّے میں مسلح عوامی جدوجہد کی حامی کسی بھی مصروفِ جنگ حریت پسند تنظیم کی کبھی نہ تو حمایت کی اور نہ ہی مدد۔ فیلڈ مارشل ایوب خان اور جرنل یحییٰ خان بھی اس سے مستثنے نہیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ روایتی جرنیلوں کی حکومتوں نے حریت پسندوں کے مخالف عناصر سے ایسے گٹھ جوڑ کئے جو حریت پسندوں کے لئے مشکلات کا باعث بنے۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ الجزائر ویت نام، فلسطین اور افریقہ کی دوسری حریت پسند تنظیموں کو فوجی آمریت کے دور میں نہ صرف یہ کہ مناسب سرکاری پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ بلکہ سرکاری پروپیگنڈہ مشنری انہیں "چھاپہ مار" تنظیموں کے نام سے عوام میں متعارف کراتی رہی اور "چھاپہ مار" کے تصوّر کو کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا۔ گویا یہ اچھے اور سلیقہ مند سپاہیوں کا شعار نہیں۔ بلکہ (gangster) اور (Desparado) قسم کے پیشہ ور ڈاکوؤں اور رہزنوں کا شیوہ ہے اپنی مخصوص ذہنی پرداخت کے باعث روایتی فوجیوں کا مسلح عوامی جدوجہد کے نظریے سے تطابق ممکن ہی نہیں اور جب روایتی جرنیلوں کو سیاسی قیادت کے باعث مفادات خصوصی بھی حاصل ہوں تو ایسی صورت میں وہ انسانوں کی آزادی کے لئے چلائی جانے والی مسلح عوامی تحریکوں کو اپنا حریف اور دشمن تصوّر کرتی ہیں۔ پاکستان کا فوجی حکمران ٹولہ اپنے دور اقتدار میں کبھی بھی کشمیر میں عوامی طرز کی مسلح جدوجہد آزادی کا حامی نہیں تھا اس ٹولے کو اس نظریے سے اتنی ہی نفرت تھی جتنی قرآن اولیٰ کے مسلمانوں کو سؤر کے گوشت سے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ اپنے مقصد کے اعتبار سے محض ایک کوشش ناکام ثابت ہو کر رہ گئی اور کشمیری عوام کے لئے انجام کار اس دستاویز غلامی پر منتج ہوئی جسے عرفِ عام میں معاہدہ تاشقند کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو زیرِ عتاب لائے جانے کی اصل وجہ فوجی حکمرانوں کی یہی بنیادی مخاصمت ہے۔

خفیہ فائل میں چار سال تک

"گڈ ریمارکس" کا مطلب افسروں کی چاپلوسی

ملازمین نے تنخواہوں کے نئے اسکیل کو رد کر دیا

الفتح رپورٹ

پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن لائن اسٹاف نے ۱۰ اگست کی رات بارہ بج کر ۵ منٹ سے غیر معینہ مدت کے لئے ہڑتال کر دی ہے۔ پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن لائن اسٹاف یونین تقریباً دس ہزار ملازمین کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس میں سب انسپکٹر ٹیکنیشن، کیبل ٹیکنیشن فون ٹیکنیشن، لائن ٹیکنیشن، لائن مین، وائر مین، ڈرائیوری اسٹاف ورک چارج اسٹاف اور ٹیلی کم ٹیکنیشن شامل ہیں۔ ان کی ہڑتال سے ٹیلی گراف اینڈ ٹیلی فون کا مواصلاتی نظام معطل ہو گیا ہے۔ بے شمار ٹیلی فون خراب پڑے ہیں۔ صارفین بار بار شکایات درج کرا رہے ہیں لیکن اُن کی شکایات دور نہیں ہو رہی ہیں، کیونکہ وہ دست آفرین جو تار اور ٹیلی فون کے نظام کو برقرار رکھتے ہیں ہڑتال پر ہیں۔ ٹیلی کمیونیکیشن لائن اسٹاف کی ہڑتال سے ریلوے ٹیلی گرام اور ٹیلی پرنٹرز کے معطل ہونے کا خدشہ ہے۔ اگر ریلوے لائن پر مواصلاتی نظام گڑبڑ ہو گیا تو ریلوے نظام کو بھی معطل کرنا پڑے گا۔ مواصلاتی ذرائع کے بغیر سنگین ٹریفک حادثات رونما ہونے کا خطرہ ہے۔ یہی صورتِ حال مرمت کے انتظامات نہ ہونے کی وجہ سے محکمہ ٹیلی گرام اور ٹیلی پرنٹر کے ساتھ رہیگی۔ فیڈریشن آف ٹیلی گراف سنٹر، ٹیلی فون یونین سندھ، ریلوے ورکرز یونین، کنٹرولر ٹیلی گراف اسٹورز۔ اسٹاف یونین، ٹیلی کمیونیکیشن ٹیکنیکل یونین، آئل اینڈ گیس ورکرز یونین اور ٹیلی فون آپریٹرز یونین نے پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن لائن اسٹاف یونین کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔

ہڑتال کا سبب تنخواہوں کا نیا اسکیل ہے۔ جب تنخواہوں کے نئے اسکیل کا اعلان کیا گیا تو اسی وقت پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن لائن اسٹاف نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور نئے اسکیل پر نظر ثانی کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ تنخواہوں کے نئے اسکیل سے لائن اسٹاف کی تنخواہوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ یہ بات مندرجہ ذیل گوشوارے سے ثابت ہوتی ہے۔

پرانا اسکیل

(۱) لائن مین- ۸۰ — ۲ — ۱۰۰ - ای بی — ۳ — ۱۱۸

(۲) ٹیکنیشن ۱۳۵ — ۵ — ۱۷۰ - ای بی — ۱۰ — ۲۷۰

ای بی — ۱۵ — ۳۱۵

نیا اسکیل

۱۱۰ — ۳ — ۱۵۲ - ای بی — ۴ — ۱۶۰

۱۸۰ — ۱۰ — ۲۵۰ - ای بی — ۱۰ — ۳۰۰

ای بی — ۱۵ — ۳۱۵

نئے اسکیل میں کہا گیا کہ کسی ملازم کو کارکردگی کی حد کراس کرنے کی اجازت اس وقت دی جائے گی جب افسر اس کی "خفیہ فائل" میں چار سال تک "گڈ" کا اندراج کرے۔ اگر افسر نے تین سال تک "گڈ" کا اندراج کیا اور چوتھے سال "گڈ" کے ریمارکس نہیں دے تو اُس ملازم کو سالانہ ترقی نہیں دی جائے گی وہ چار سال مزید انتظار کرے اور "گڈ" کارکردگی دکھائے۔ اِس اسکیل میں سب سے بڑی خامی یہی ہے۔ کیونکہ اوّل تو اُسے چار سال تک کوئی سالانہ ترقی نہیں ملے گی۔ دوم "گڈ انٹری" کی شرط نہایت کڑی ہے۔ عوام بلکہ خود اربابِ اقتدار بخوبی جانتے ہیں۔ کہ وطن عزیز میں کوئی ملازم اپنی اعلیٰ کارکردگی اور صلاحیت کی بناء پر ترقی اور اعلیٰ عہدہ کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ افسروں کی خوشامد اور چاپلوسی ہی ترقی کی ضامن ہے۔ کوئی ایماندار باصلاحیت اور ہنرمند ملازم چار سال تک "گڈ ریمارکس" نہیں لے سکتا۔ "گڈ ریمارکس" لینے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے افسروں کی خوشامد کرے۔ اُن کی بدعنوانیوں پر پردہ ڈالے۔

ٹیکنیشن کو دو سال کی فنی تربیت دی جاتی ہے۔ اِس لئے پرانے اسکیل میں ٹیکنیشن کی تنخواہ کلرکوں اور ٹیلی فون اپریٹروں سے زیادہ رکھی گئی تھی۔ ٹیکنیشن کی تنخواہ کا اسکیل ۱۳۵-۳۱۵ اور کلرک ٹیلی فون آپریٹر کا ۱۱۰-۲۷۰ تھا۔ لیکن نئے اسکیل میں تینوں کی تنخواہوں کا اسکیل یکساں کر دیا گیا۔ اِس کا مطلب ہے ٹیکنیشن کو دو سال کا تربیتی کورس مکمل کرنے کے باوجود غیر تربیت یافتہ کلرک کے برابر تنخواہ ملیگی۔

تنخواہوں کے نئے اسکیل کے اعلان سے قبل حکومت نے یہ کہا تھا کہ نئے اسکیل میں ایک دفعہ یہ رکھی جائے گی کہ جب کوئی ملازم اپنے اسکیل کی آخری تنخواہ پر پہنچے گا تو وہ خودبخود دوسرے اعلیٰ اسکیل کے تحت آجائے گا۔ اِس طرح اس کی تنخواہ میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ لیکن جب نئے اسکیل کا اعلان کیا گیا تو ملازمین کو سخت مایوسی ہوئی۔ دوسرے اعلیٰ اسکیل کے تحت آجانا تو درکنار اپنے ہی اسکیل میں چار سال کے لئے سالانہ ترقی روک دی گئی۔ چنانچہ پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن لائن اسٹاف یونین نے سخت احتجاج کیا۔ اُس کے ارکان نے ایک مرتبہ بطورِ احتجاج پہلی تاریخ کو تنخواہ بھی وصول نہیں کی۔

جب باہمی گفت و شنید ناکام ہو گئی تو یونین نے ۲۰ جولائی ۱۹۷۲ء کو ہڑتال کا نوٹس دیا۔ مرکزی وزیرِ خزانہ اور گورنر پنجاب نے اِس موقع پر مداخلت کی اور پندرہ دن کی مہلت مانگی۔ یہ مدّت بھی گذر گئی لیکن حکومت نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ پُراسرار خاموشی اختیار کی لہذا یونین نے دوسرا نوٹس دیکر ۱۰ اگست کی رات سے غیر معیّنہ مدّت کے لئے ہڑتال کر دی۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت اور محکمہ ہڑتال کے بعد عوامی مفاد کے پیشِ نظر اور مواصلاتی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے یونین کے مطالبات تسلیم کر لیتے۔ لیکن وہ دھمکیوں کے ذریعے ٹیلی گراف اینڈ ٹیلی فون کے محنت کشوں کی جائز جدوجہد کو روکنا چاہتی ہے۔ لیکن اب یہ حربے فرسودہ ہو چکے ہیں۔ محنت کش اپنے اتحاد کی بدولت ضرور کامیاب ہوں گے۔

پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن لائن اسٹاف یونین کے چند مطالبات مندرجہ ذیل ہیں۔

- لائن اسٹاف کی کارکردگی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے نیشنل پے اسکیل پر نظرِ ثانی کی جائے اور واجبات یکم مارچ ۱۹۷۲ء سے فوراً ادا کئے جائیں۔ چار سال تک "گڈ انٹری" کی شرط کالعدم قرار دی جائے۔
- ۱۹۶۴ء، ۱۹۶۶ء، ۱۹۶۹ء کے معاہدوں پر مکمل طور پر فوراً عمل کیا جائے۔ معاہدوں کے بعد جو ملازمین مختلف کیڈرز میں بھرتی کئے گئے ہیں۔ انہیں ٹیکنیشن کیڈر میں ضم کیا جائے۔
- ۱۹۶۹ء کے معاہدہ کے مطابق ڈکٹ الاؤنس یکم جنوری ۱۹۶۹ء سے ادا کیا جائے۔
- اسپیشل پے، پرسنل پے، آؤٹ ڈور الاؤنس کی ادائیگی اُسی تاریخ سے کی جائے جس تاریخ سے اُس کی کٹوتی کی گئی تھی آؤٹ ڈور الاؤنس الیکٹرانک پلانٹ کے تمام ٹیکنیشنوں کو دیا جائے۔
- ٹیکنیکل پے ۳۰ روپے اور میڈیکل الاؤنس ۵۰ روپے ماہانہ دیا جائے اور اُسے تنخواہ میں شامل کیا جائے۔
- نیا اسٹاف اسٹنڈرڈ یونین کے مشورے سے بنایا جائے

الفتح

پیپلز پارٹی کی تنظیم - عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں



کیا سوشلزم اسی کا نام ہے؟

عبدالرحیم قریشی - رکن پیپلز پارٹی - کورنگی، کراچی

سرمایہ داری نظام ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء اور ۱۹۷۰ء تک تو بالکل ہی دم توڑ چکا تھا۔ اس وقت پیپلز پارٹی وجود میں آئی۔ اس کے منشور کو غریب عوام کے لیے نیک فال پایا۔ ہم نے آپ اپنے کو بحیثیت کارکن اس پارٹی کی خدمات کے لیے پیش کر دیا۔ کیونکہ اجتماعی فوائد ہی قوم اور ملک کی ترقی کا باعث بن سکتے ہیں۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس نکلی۔ پیپلز پارٹی سوشلزم کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں نکل آئی اور اس نے وقتی طور پر سرمائے داروں کی مخالفت کر کے مزدور کسان اور روٹی کپڑا مکان کی بات کی۔ غریبوں نے سوچا کہ یہ ہی جماعت ہمیں مصائب سے نجات دلا سکتی ہے۔ لہٰذا ہم اس پارٹی کے منشور کو لے کر گھر گھر پہنچے۔ عوام اس لمبے چوڑے وعدوں کے فریب میں آ گئے اور سوشلزم کے حق میں ووٹ دیا حالانکہ ہم اس بات کو بھول گئے تھے کہ سوشلزم لانے والے غریب اور غریب رہنما ہوتا ہے۔ سوشلزم، سرمائے دار کبھی نہیں لایا مگر منشور کی پابندی پارٹی کی بقا اسی میں ہے کہ فوراً اسلامی سوشلزم نافذ کر دیا جائے۔ ورنہ عوام کے، پارٹی کے کارکنوں پر اُٹھے ہوئے ہاتھ ان اونچی صفوں کے لیڈروں کے گریبانوں تک نہ پہنچ جائیں اور ایک ایسا انقلاب نہ آ جائے جہاں سرمایہ دار نام کی کوئی چیز یا ان کے تحفظ کرنے والے بھی باقی نہ بچیں۔ یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ہم عوامی رجحانات کا بغور مطالعہ کر رہے ہیں اور عوام کے طعنے سن رہے ہیں کہ ہم ان کے پاس ووٹوں کے لیے گئے تھے۔ لیکن پاکستان پیپلز پارٹی میں اقتدار، ہوس اور زر پرستی کے باعث بھرے ہوئے وڈیرے اور سرمائے دار پارٹی کے منشور کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں سوشلزم کس طرح آ سکتا ہے۔ یہ لوگ کس دل سے اپنی جائیدادیں چھوڑیں جو غریب عوام کے خون پسینے پر تعمیر کی ہوئی دولت جانے کی بات آئی تو پارٹی کے منشور سے بغاوت یقینی ہے۔ میرے خیال میں میری پارٹی کو سوشلزم کا نام نہیں لینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ کارکنوں طالبعلموں مزدوروں اور کسانوں کی توہین ہے۔ مجھے بتائیں سوشلسٹ حکمران کہ ۱۰ مارچ کی زرعی اصلاحات جو ایک انقلابی اقدام ہے، اس پر عمل ہُوا یا نہیں، یا کتنے مزارعوں کو فائدہ پہنچا۔ تعلیمی پالیسی کا کیا بنا؟ بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ لسانی زبان کا مسئلہ ہی اس پارٹی کے سرمائے دار عناصر کی وجہ سے وجود میں آیا ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر خنجر چلائے جا رہے ہیں۔ ابھی پندرہ دِن ہی کی بات ہے کہ ہماری پارٹی کے سرمائے دار دولت مند وزیروں اور اعلیٰ احکام نے سوشلزم کا نعرہ لگانے والے مزدوروں پر اندھا دھند فائرنگ کرائی اور اپنی اصلیت کا ثبوت دیا۔ کیا سوشلزم میں یہی کچھ ہوتا ہے کہ مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کو ان کا حق مانگنے پر گولیاں دی جائیں اگرچہ مزدوروں کے قاتل سندھ انتظامیہ کو نہیں ہٹایا گیا تو صدرِ مملکت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ مزدوروں کا بہنے والا لہو ضرور رنگ لائے گا۔

پارٹی کو سرمایہ داروں کے حوالے کر دیا گیا ہے

شیخ خالد محمود رکن پیپلز پارٹی - سیالکوٹ

(۱) —— پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پارٹی منشور کے بالکل الٹ کام ہو رہا ہے۔

(۲) —— عوام نے پیپلز پارٹی کی قیادت سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی ہیں۔ پارٹی میں سرمایہ دار آ گئے ہیں۔ مخلص اور بے لوث کارکنوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، رشوت اور لوٹ کھسوٹ اب بھی جاری ہے

(۳) —— سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنماؤں کا رویّہ ناقابلِ برداشت ہے۔ عوامی نمائندے کارکنوں کو اب سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کرتے ایک ایم پی اے صاحب جو الیکشن سے قبل خود دن میں دو مرتبہ سلام کرنے آتے تھے آج انہیں سلام کرو تو کوئی جواب نہیں دیتے۔

(۴/۵) —— کارکنوں کے اتحاد اور تنظیم کے لیے محنت اور بے لوث کام کرنے کی لگن ہونی چاہیئے، وہ ہم کارکنوں میں تو ہے۔ البتہ ایم۔ پی۔ اے اور ایم این اے وغیرہ بھلا چکے ہیں۔

(۶) —— رہنماؤں سے ہمارا رابطہ ہی ختم کر دیا گیا ہے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتے کیا ہو رہا ہے۔

(۷) —— موجودہ صورتِ حال میں کوئی کسی پر کنٹرول نہیں کر سکتا۔

(۸) —— بالکل غلط! پولیس کا رویہ آج بھی وہی ہے جو آج سے دس یا بیس برس پہلے تھا۔ پولیس خود ہی سب کچھ کراتی ہے۔ کسی کے کام میں کوئی کارکن مداخلت نہیں کرتا۔

۱۴ ر اگست ۱۹۷۲ء کا پاکستان ——— علی جمالی کے قلم سے

کس دیس کا پتہ پوچھتے ہو؟

یہ ۱۳ اور ۱۴ اگست کی درمیانی شب ہے۔

یہ ۱۹۴۷ء ہے۔

گجر بج رہا ہے۔

گجر کی سوئی آہستہ آہستہ گیارہ بج کر ۶۰ ویں منٹ کی طرف بڑھ رہی ہے۔

مسلمان جاگ رہا ہے۔

مسلمان کٹ رہا ہے۔

مسلمان خون کا نذرانہ پیش کر رہا ہے۔

مسلمان گجر کی سوئی کو تک رہا ہے۔

وقت کی سوئی۔ پہاڑ رات طے کر رہی ہے۔

یہ عجیب وقت ہے۔

یہ عجیب سماں ہے۔

یہ عجیب منظر ہے۔

منزل کا نشان ابھر رہا ہے۔

گجر کی سوئی نے بارہ بجا دیئے۔

ایک آواز گونجی۔

"پاکستان مبارک"۔

"پاکستان زندہ باد۔"

"پاکستان پائندہ باد۔"

کروڑوں آوازوں نے لبیک کہا۔

یہ اُن جیالوں کی آوازیں ہیں جنہوں نے باہم عہد کر رکھا ہے کہ پاکستان میں ایک مثالی معاشرہ قائم کریں گے۔ عدل و انصاف جس کی بنیاد ہوگی۔ جہاں ہر محکوم کا ہاتھ حاکم کی غلطی پر اس کے گریبان تک پہنچنے سے گریز نہیں کرے گا۔

جہاں کھیت بھوک نہ اگائیں گے۔

جہاں کارخانوں میں بننے والا کپڑا بندگانِ خدا کا تن ڈھانپے گا

جہاں مشینوں کے پہیئے ناداری کو ختم کرنے میں دن رات چلا کریں گے۔

جہاں انسان پر انسان ظلم نہ کرے گا۔

جہاں خوفِ خدا انسان پر انسان کو ظلم کرنے سے باز رکھے گا۔

جہاں استحصال کسی شکل میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔

یہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا سورج ہے۔ یہی پیام لے کر طلوع ہوا ہے کہ ظلم کی کالی رات کٹ چکی۔ صدیوں کے استحصال کے ختم ہونے کا دن نکل آیا۔ جاگو سویرا ہو چکا، اٹھو ہمت سے کام لو، اٹھو بھرپور عزم کے ساتھ اٹھو کہ تم نے یہ منزل خون دے کر پائی ہے، اپنوں کا خون، پیاروں کا خون، دلبروں کا خون، جاں نثاروں کا خون، معصوموں کا خون، بیٹوں کا خون، بہنوں کا خون، ماؤں کا خون، بیٹیوں کا خون باپوں کا خون۔

لیکن سامری جو شریکِ سفر نہ تھے گھات میں ہیں، تاک میں ہیں۔ لبادہ تبدیل کر رہے ہیں، چولا بدل رہے ہیں، صفیں مرتب کر رہے ہیں کہ محمد علی جناح کے پاکستان کی بنیادیں مضبوط نہ ہونے پائیں پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو پائے۔ پاکستان کے گرد حصار باندھا جا رہا ہے۔ اندرونی طاقتیں پاکستان کو نرغے میں لا رہی ہیں۔

عوام ہر اندرونی اور بیرونی وار کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ عوام منتظر ہیں کہ ان اندرونی اور بیرونی طاقتوں، جنہوں نے دن رات اپنی تمام تر قوت پاکستان کی راہ روکنے میں صرف کی تھی۔ اُن کے ساتھ وہ سلوک جس کے وہ مستحق ہیں کیوں نہیں کیا جا رہا ہے۔ یہ سوال کروڑوں ذہنوں میں کلبلا رہا ہے۔ کیونکہ یہ سب محض جناح دشمنی میں سوادِ اعظم سے کٹ گئے تھے۔ یہ نام اب گنوانے سے کیا فائدہ، کیا حاصل ہم سب کچھ پا کر کھو چکے ہیں، یہ سب کچھ کھو کر پا رہے ہیں۔ لیکن آج بھی لوگ ان کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ کوئی ہمت تو کرے۔؟ کوئی ان کے نام تو پوچھے۔؟

جناح اپنا گھر تو نہیں بنا رہا تھا۔ جناح مسلمانوں کا محبوب قائدِ اعظم ان کروڑوں مسلمانوں کے لئے ایسا گھر بنا رہا تھا جس میں سب کے لئے امن کی ضمانت تھی۔ خیر کا وعدہ تھا۔ بھلائی کا پیغام تھا۔

آج اس سورج کی ۲۵ ویں گردش کا دن ہے۔ اور آج ہم اُن اپنوں کے ہاتھوں وہاں پہنچے ہیں جو ہماری منزل نہ تھی۔ ہم نے یہ منزل کیوں کھوئی۔؟ ہمارے کھیت کیوں بھوک اگاتے رہے؟ ہماری مشینوں کے پہیئے دن رات چلنے کے باوجود ناداری کیوں بڑھاتے رہے۔؟ انسان، انسان پر ظلم کیوں کرتا رہا؟ خوفِ خدا کیا ہوا۔؟ استحصال کیوں برداشت کیا گیا۔ دامانِ وطن کیوں تار تار ہوتا رہا۔؟ اس گناہ میں کون کون شریک رہے۔ ان اپنوں کے علاوہ اور وہ سب لوگ جو جہاں پر بھی حلقۂ اقتدار و اختیار میں تھے، اپنے وعدوں سے مکر گئے۔ اپنی باتوں سے پھر گئے۔ اپنے عہد کو توڑتے رہے اور ان کے ظلم کی چکی کا پاٹ ہر ایک کو پیستا رہا۔

لیکن وطن نے اپنی بقاء اور استحکام کے لئے جب بھی خون مانگا اُسے ملتا رہا۔ آج بھی جلو موڑ کے نزدیک مینارِ شہدا پر یہ لکھا ہے کہ "ہم اپنا آج تمہارے کل پر قربان کر گئے"۔ کون سا کل؟ جو آج ہے وائے حسرت! کہ ہم آج بھی شرمسار نہیں، ہم آج بھی دیانت دار نہیں ہم آج بھی امانت دار نہیں۔

آج ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء ہے۔ آج دلوں کو ٹٹولنے اور جوڑنے کا دن ہے۔ آج پاکستان پھر نرغے میں ہے آج پاکستان کے گرد حصار بندھ چکا ہے۔ یہ بڑا ہی سخت وقت ہے۔ یہ آخری امتحان کا وقت ہے۔ اس وقت کے بعد اجالا نہیں اندھیرا ہے۔ اور ایسا اندھیرا جو کبھی روشنی نہ پائے گا۔ جب تک کہ ہم پنجابی، بلوچ، پٹھان، سندھی اور اپنے ہی وطن میں بسنے والے خود ساختہ مہاجر، باہم مل کر رہنے کا عہد تازہ نہ کریں۔ اور عہد نبھانے کا پوری دیانت داری سے جہاں پر بھی ہم ہیں اپنے دلوں سے وعدہ نہ کریں۔ کہ ہمیں ایک دوسرے کی بھلائی چاہیئے۔ بھلائی چاہیئے، بھلائی چاہیئے برائی نہیں۔ بھلائی کا بیج بھلائی کی فصل کاٹے گا۔ اور برائی کا بیج برائی کی فصل کو پروان چڑھائے گا۔ کیا ہم اتنے برے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کی بھلائی نہیں سوچ سکتے۔ بھلائی نہیں چاہتے۔ سیاسی شعبدہ بازیوں کا وقت ختم ہو چکا اپنے بچوں پر رحم کرو

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمایئے



کنری

ہمیں زبان نہیں — روٹی چاہیئے

غازی مختار

آج کل زبان کا مسئلہ ایک بڑا مسئلہ ہے تھا تو نہیں پر بنا دیا گیا۔ سینکڑوں جانیں ضائع ہوئیں۔ میں ایک مہاجر ہوں (میں ذاتی طور پر مہاجر کہلوانے کا مخالف ہوں) مگر اردو یا سندھی دونوں میں سے کوئی میری مادری زبان نہیں۔ کیونکہ ہمارے گھر میں راجپوتانہ کی زبان مارواڑی بولی جاتی ہے۔ جہانتک میری تعلیم کا تعلق ہے۔ ایوب صاحب کے نزول سے قبل سندھ میں اردو سندھی دونوں پڑھی ہیں اس لیے اگر خود کو زبان کے معاملے میں غیر جانبدار کہوں تو غلط نہیں ہو گا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو سندھ پاکستان کا واحد صوبہ ہے جس نے ہر علاقہ کے لوگوں کو بڑی فراخدلی سے قبول کیا اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ خود کو "سندھی" کہلواتے ہیں، ان میں سے ۸۰ فیصد باہر سے آئے ہوئے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے۔ جسے واقعی مادری زبان کہا جائے وہ سندھی نہیں بلکہ بلوچی، بروہی، سرائیکی، تھری یا ناڑی والی وغیرہ ہیں۔ سید صاحب جو سندھ میں ایک بڑی فساد کی جڑ ہیں وہ خود بھی سندھی نہیں۔ لوگ سندھ کی تہذیب کو صدیوں پرانا بتاتے ہیں جو اپنی جگہ درست ہے مگر یہ تہذیب صرف سندھی بولنے والوں کی نہیں اس میں کئی زبانیں بولنے والوں کا حصہ ہے۔

۱۹۴۷ء سے پہلے جو لوگ سندھ میں آکر آباد ہوئے وہ سب خود کو سندھی کہلواتے ہیں۔ مگر ۱۹۴۷ء کے بعد جو لوگ سندھ میں آکر آباد ہوئے وہ خود کو اب تک سندھی نہیں کہلواتے۔ جن بچوں کے ماں باپ بھی سندھ میں پیدا ہوئے وہ بھی خود کو مہاجر کہتے ہیں۔ مہاجر کوئی قوم نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں یا اس کے بعد آکر سندھ میں آباد ہونے والوں نے خود کو پہلے سے آباد سید پٹھان بلوچ وغیرہ سے افضل سمجھا۔ زبان کسی کی میراث نہیں، زبان علم ہنر جو چاہیے سیکھ سکتا ہے۔ کوئی زبان اس وقت تک ختم نہیں ہوتی جب تک خود بولنے والے اس کا گلا نہ گھونٹ دیں۔ میرے پاس اس کا بڑا ثبوت یہ میری مادری زبان اب پڑھی لکھی نہیں جاتی مگر آج ۲۵ برس گزرنے کے بعد بھی ہم یہ زبان نہیں چھوڑ سکے نہ کوئی چھڑا سکا۔ پھر میرے سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ زبانیں جو لکھی پڑھی بھی جاتی ہیں (اردو سندھی) وہ کیسے ختم ہو سکتی ہیں۔

جہاں تک میں نے سندھی زبان کا بل پڑھا یا سمجھا ہے مجھے اردو کے خلاف کچھ نہیں دکھائی دیا۔ اور جن لوگوں نے اس بل کے خلاف ہنگامے، ہڑتالیں اور فساد کیے اور کرائے (سندھی اردو دونوں) ان کے نزدیک اگر بل اردو کے خلاف تھا تو جو آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے اس میں ایسی کیا ضمانت تھی کہ وہ لوگ خاموش ہو کر بیٹھ گئے اور اردو اور سندھی کے نمائندوں نے (جن میں کچھ فساد کرانے میں بڑھ چڑھ کر شامل تھے) اس کی حمایت میں بیان جاری کیے، تقریریں کیں۔ اردو کا حق مل جانے کا اقرار کیا۔ حالانکہ آرڈیننس میں وہی کچھ ہے جو بل میں تھا

میں نے سندھ میں ہوش کی آنکھیں کھولی ہیں اور اس وقت سے سندھی کو سندھ کی سرکاری زبان دیکھ رہا ہوں۔ تھانہ میں جا کر چاہے کوئی کسی زبان میں بیان دے اس کا بیان سندھی میں ہی لکھا جاتا ہے۔ پولیس کا سارا ریکارڈ فارم، رجسٹر سمن، وارنٹ ہر چیز سندھی میں ہے۔ پاکستان کی معیشت میں بڑا حصہ زراعت کا ہے اور محکمہ زراعت سندھ کا سارا کام سندھی میں ہوتا ہے۔ محکمہ آبپاشی کا سب کام سندھی میں ہو رہا ہے۔ ٹاؤن کمیٹیوں یونین کونسلوں، میونسپل کمیٹیوں کا سارا کام سندھی میں ہو رہا ہے۔ چاہے ان محکموں کے ملازم اردو سندھی فارسی یا کوئی زبان بولنے والے ہوں۔ انہیں ۲۵ برس سے کوئی تکلیف پیش نہیں آئی۔ پھر اگر بل میں سندھ کی سرکاری زبان سندھی کو مقرر کیا (جو پہلے سے ہے) تو کونسا پہاڑ ٹوٹ گیا۔ سندھ میں سندھی کے علاوہ دفتروں میں اگر کوئی دوسری زبان چلتی ہے تو وہ انگریزی ہے جو قومی زبان کی جگہ غاصب بنی بیٹھی ہے۔ اگر اردو کے حق میں لوگوں کو لڑانے والے اردو کے واقعی حامی تھے تو انہیں سندھی کی مخالفت کی بجائے حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیئے تھا کہ انگریزی کی جگہ فوراً اردو رائج کرو اور میرے نزدیک اس سے بڑھ کر اردو کی کوئی خدمت نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہونے سے اردو کو سندھی کی نسبت افضل درجہ ملے گا جس سے اردو کی ترقی اتنی زیادہ ہو گی جس کا لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اردو کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ انگریزی ہے۔

سندھی کی حمایت میں اردو بولنے والوں اور خصوصاً مہاجروں کے خلاف نفرت پھیلانے اور سندھیوں کو قتل و غارت گری پر اکسانے والوں کو پہلے خود اپنا تجزیہ کرنا چاہیئے کہ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو خالصتاً سندھی ہیں۔ اگر وہ خود باہر سے آکر آباد ہونے والوں میں سے ہیں تو کس منہ سے مہاجروں یا اردو بولنے والوں کو سندھ سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر واقعی سندھ کے باشندوں کے علاوہ کسی کا اس صوبہ پر حق نہیں ہے تو پھر سندھ کی ۸۰ فیصد آبادی کو سندھ چھوڑ کر کہیں اور چلا جانا چاہیئے چند لوگ بشمول سید صاحب یہ کہتے ہیں کہ مہاجر سندھ میں

کون کیا کر رہا ہے؟

اپنے رہنماؤں کا محاسبہ کیجئے

ہمارا سلسلہ "پاکستان پیپلز پارٹی کی تنظیم، عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں؟" انتہائی کامیاب رہا۔ ہم اپنے قارئین اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے انتہائی شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اپنی سچی اور دلی رائے کا اظہار کر کے الفتح کے صفحات کو وقعت بخشی۔ اب اس کامیاب سلسلے کے اختتام کے بعد ہم قارئین الفتح اور سیاسی کارکنوں کو دعوت دے رہے ہیں کہ وہ مندرجہ ذیل سوالات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ (۱) موجودہ حکومت کے وزرائے کرام میں کون کیا کردار ادا کر رہا ہے۔ کونسے وزراء پارٹی منشور کے مطابق ہیں اور کونسے مخالفت کر رہے ہیں۔

(۲) حزب مخالف کے رہنماؤں میں کس کا کردار وطن دوست ہے اور کون وطن دشمنی پر مبنی حرکتیں کر رہے ہیں

زمینوں اور جائدادوں کے مالک بن گئے ہیں۔ اگر یہ جرم ہے تو وہ خود اس کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ کیا بلوچستان، ایران، عراق یا عرب وغیرہ سے آنے والے یہ صاحبان اپنی زمینیں اور جائداد، کندھوں پر لاد کر سندھ آئے تھے۔ انہوں نے سب کچھ یہیں آکر بنایا ہے۔

دوسری طرف اگر مہاجروں نے پاکستان کے لیے قربانیاں دی تھیں تو انہوں نے سندھ پنجاب یا بلوچستان پر کوئی احسان نہیں کیا۔ انہیں انگریزوں اور ہندوؤں کی غلامی سے نجات حاصل کرنی تھی۔ الگ ملک بنانا تھا۔ اور جو لوگ سندھ میں آباد ہوئے انہیں ان کے گھر چھوڑنے کا بدل مِلا یا انہوں نے اپنی کوششوں سے حاصل کیا بلکہ کچھ نے اصل سے زیادہ پایا۔ پھر یہ لوگ خود کو پہلے سے آباد سندھیوں سے خود کو کس طرح افضل سمجھ رہے ہیں۔ اگر وہ سندھ میں آکر آباد ہو ہی گئے ہیں تو خود کو سندھی کہلوانے میں کیوں جھجکتے ہیں۔ ان کی دو نسلیں یہاں پیدا ہوئیں مگر ہر پہلی نسل نے آنے والی نسل سے یہی کہا کہ ہم مہاجر ہیں۔ انہوں نے خود سندھ پر جو ان کا حق ہے اسے چھوڑ دیا۔ ۲۵ برس ہوئے خود کو سندھی ہی نہیں مانا۔ پھر کس منہ سے سندھ پر اپنا زائد حق جتایا جاتا ہے۔ اگر سندھ پر حق ہے تو پہلے سندھی بنو اور یہ کوئی بڑی بات نہیں!

مَیں نے اردو اور سندھی کے مسئلہ پر جتنا سوچا ہے یہی نتیجہ نکالا کہ یہ سب مفاد پرستوں کا کیا دھرا ہے۔ سرمایہ داروں، وڈیروں، جاگیرداروں اور نوابوں کی غریبوں کے خلاف سازش ہے جس میں حکومتِ سندھ کے سربراہ اور اردو کے نام نہاد ٹھیکیدار ملوث ہیں۔ چند بدکردار لوگوں نے زبان کے مسئلے کو اتنی ہوا دی کہ ایک مسلمان نے دوسرے مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگے اور حکومت نے خود اس مسئلے کو طول دیا۔

نئے اور پرانے سندھی کی اصطلاح بکواس ہے۔ ایک پانچ سالہ بچہ پرانا سندھی ہے تو پچاس سالہ بوڑھا نیا سندھی ہے..... ! سندھ میں رہنے والے سب سندھی ہیں نئے اور پرانے کا کیا مقصد؟ جنہیں نئے سندھی کہا جاتا ہے، ۲۵ برس سے سندھ میں رہ رہے ہیں اب کوئی نیا سندھی نہیں

پہلے پنجاب کا وفد سندھ میں پنجابیوں کی دیکھ بھال کے لیے آیا تھا، میرے شہر کنری میں بھی آیا۔ چند چوہدریوں کے سوا کسی کو علم تک نہ ہوا۔ چوہدریوں کے ساتھ چائے پی اور چلا گیا۔ اب سرحد اور بلوچستان کا وفد گھوم رہا ہے ان تینوں حکومتوں نے ہمارے ساتھ نیکی نہیں کی ایک طرف تو انہوں نے پنجابی، بلوچی یا سرحد والوں کی ہمت بڑھائی اور دوسری طرف مہاجر اور سندھیوں کو عضوِ معطل سمجھ کر چھوڑ دیا جن کا اصل جھگڑا ہے۔ انہیں ہمارے صوبے میں آکر کسی کو حوصلہ اور کسی کو محرومی کا احساس دلانے کی کیا ضرورت تھی۔ جبکہ یہاں آباد پٹھان پنجابی، بلوچی سب سندھی ہیں۔ اگر ان وفود کو آنا ہی تھا تو آپس کی نفرت اور غلط فہمیوں کو دُور کرنا چاہیئے تھا۔ بھائی چارے کی فضا پیدا کرنی چاہیئے تھی نہ کہ پیدا ہونے والی خلیج کو بڑھانا ——— !

ہمیں سندھ میں رہنا ہے۔ اس صوبہ کی بنیادوں میں ہمارا خون ہے۔ ہم سندھ کے ہیں سندھ ہمارا ہے ہمیں لوگوں کے مفاد پر خود کو قربان نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں روٹی چاہیئے، ہم سے فارسی بلواؤ، لکھواؤ یا پڑھواؤ! ہمارا مسئلہ زبان نہیں روٹی ہے۔ ہم سب سندھی ہیں۔ سندھ ہمارا اور ہم سندھ کے ہیں۔ ہمیں آنکھیں کھولنی چاہئیں ——— !

سکھر

یونائیٹڈ بنک سپروائزری

اسٹاف یونین کا قیام

نمائندہ الفتح

اب بنکوں کے سپروائزری اسٹاف میں اجتماعی جدوجہد کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔ وہ متحد ہو رہے ہیں۔ اپنی یونینیں بنا رہے ہیں۔ یونائٹڈ بنک لمیٹڈ سپروائزری اسٹاف یونین سکھر زون کا قیام اس کا ثبوت ہے۔ گذشتہ دنوں اس یونین کے عہدیداروں کے انتخابات ہوئے جس میں مندرجہ ذیل افراد منتخب کیے گئے۔

(۱)	امداد حسین شیخ	صدر
(۲)	عبدالوہاب قاضی	نائب صدر
(۳)	خواجہ جاوید احمد	جنرل سیکرٹری
(۴)	محمد حسین شیخ	جوائنٹ سیکرٹری
(۵)	عبدالستار	خازن

اراکین مجلس عاملہ

۱۔ سید محمد عباس شاہ
۲۔ محمد رفیق انور
۳۔ اکبر حسین زیدی
۴۔ بی۔ ایچ۔ صدیقی
۵۔ محمد بن حبیب

اس یونین میں یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ سکھر زون کی ۴۰ شاخوں کا سپروائزری اسٹاف شامل ہے۔ افسروں کی اجتماعی جدوجہد سے خائف ہو کر بنک کی انتظامیہ نے انتقامی کارروائیاں شروع کر دیں۔ یونین کی پریس ریلیز میں کہا گیا ہے کہ بنک کے نائب صدر مفتی محمد شبیر نے سپروائزری اسٹاف کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے اور یونین کو مفلوج بنانے کے لئے مختلف حربے استعمال کیے۔ یونین کے صدر اور جنرل سیکرٹری کا تبادلہ کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ تبادلہ غیر قانونی تھا۔ انتظامیہ کے اس اقدام کے خلاف یونین نے سخت جدوجہد کی۔ آخر کار مفتی محمد شبیر کو تبادلے کے احکامات واپس لینے پڑے۔

کراچی

قانون کے محافظ تماشہ دیکھتے رہے

نمائندہ الفتح

ہوٹل اور ریسٹورنٹ کے ملازمین خاص طور پر اور ملک کے دیگر مزدور عام طور پر نئی لیبر پالیسی اور مزدور قوانین کی کمزوریوں کی بناء پر غیر قانونی برطرفیوں اور انتقامی کارروائیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ جب بھی ہوٹل کے ملازمین نے باعزت روزگار اور مناسب تنخواہ کے لیے ڈیمانڈ نوٹس دیا یا یونین تشکیل دی تو ان کے خلاف غنڈہ گردی اور انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس بات کا انکشاف پانچ ہوٹلوں کے ملازمین کی ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں کیا گیا۔

نئی لیبر پالیسی کے تحت قانون میں یہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ مزدوروں اور مالکان کو غیر قانونی کام کرنے پر پولیس بلا وارنٹ گرفتار کر سکتی ہے مگر بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس قانون کے تحت صرف مزدوروں کو ہی گرفتار کیا گیا اور اب اسپنسرز بار کے ملازمین کے وارنٹ جاری کیے گئے ہیں ان ملازمین کا قصور صرف یہ تھا کہ انہوں نے اپنے جائز مطالبات پیش کیے تھے یا پھر یونین بنائی تھی۔

مزدور قوانین کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

نیچ لگژری کی انتظامیہ نے ۱۷ ملازمین جن کو پہلے گرفتار کرایا بعد میں وہ ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔ اب اس ہوٹل کی انتظامیہ نے ۶۶ ملازمین کو برطرف کر دیا ہے۔

اسپنسرز اسٹیک بار کے جنرل سیکرٹری اور پراپیگنڈہ سیکرٹری اور دیگر دو سرگرم کارکنوں کے وارنٹ نکلوائے گئے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ یونین کے جنرل سیکرٹری اور نائب صدر اور ایک سرگرم کارکن کو پولیس کے سامنے مالک اور منیجر نے مارا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ مالک کا بھائی ڈپٹی کمشنر ہے۔

ہوٹل نیشنل سٹی کے جنرل سیکرٹری، نائب صدر، پبلسٹی سیکرٹری اور دیگر سرگرم کارکنوں کو پہلے معطل کیا گیا اور معطلی کی مدت ختم ہونے کے بعد ہوٹل میں داخل ہونے سے جبریہ روک دیا گیا اور یہ سب صرف اس جرم میں کیا گیا کہ انہوں نے قانون کے مطابق ڈیمانڈ نوٹس دیا تھا۔

ہوٹل ڈی میکس کے مالکان کو جب ڈیمانڈ نوٹس دیا گیا تو انہوں نے ۶ ماہ کا وقت مانگا۔ جس پر انہیں وقت دے دیا گیا مگر اس کے بعد مالکان نے بات کرنے سے انکار کر دیا اور جنرل سیکرٹری اور کئی سرگرم کارکنوں کو برطرف کر دیا گیا اور باقی مزدوروں کو دھمکیاں دی گئیں۔

چو۔ چن۔ چو ریسٹورنٹ کے مالکان نے جو ملازمین ویٹروں کو صرف ستر روپے تنخواہ دیتے تھے۔ ملازمین کی ٹپ بند کرنے کے لیے بل کے ساتھ ٹیبل ٹیکس لگانا شروع کر دیا۔ ملازمین نے یونین بنائی اور سات ماہ کے ٹیبل ٹیکس کو ملازمین میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر مالکان نے غیر قانونی طور پر جنرل سیکرٹری اور دیگر سرگرم کارکنوں کو برطرف کر دیا۔

بقیہ: ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کا پاکستان

اپنے اس گھر پر رحم کرو جس گھر میں تم رہتے ہو۔ اب سماجی بھلائی کے کام کا وقت ہے۔ معاشرتی بھلائی کے کام کا وقت ہے۔ بھرپور کام کا وقت ہے۔ پتا نہیں بھلائی کے کاموں کے لئے وقت کیوں نہیں ملتا۔ بھلائی کے کاموں کے لئے مخلص کارکنوں کی ضرورت ہے۔ نہ کہ تم جیسے سیاسی شعبدہ بازوں کی، تمہاری سیاست کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ لوگ اپنا ووٹ دے چکے۔ تم اپنی قسمت آزما چکے۔ یہ روز روز آگ اور خون کا کھیل بند کرو۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔

مسلمان سو رہا ہے۔

مسلمان باہم دست و گریباں ہے۔

مسلمان، سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی اور اپنے ہی دیس میں رہنے والا مہاجر بن چکا ہے۔

مسلمان ایک دوسرے کا خون بہا رہا ہے۔

اور آج ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو ان سب سے ایک پاکستانی پوچھ رہا ہے۔

ہم سے کس دیس کا پتہ پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
یاد آئے تو محبوبِ گذشتہ کی طرح
روبرو آنے سے جی گھبرائے

بقیہ: کراچی ایئرپورٹ

بغیر جا رہے ہیں۔ یہ قانون کی سراسر خلاف ورزی ہے آپ مجھے فوری طور پر دو سو روپے دیں، ورنہ آپ جا نہ سکیں گے۔"

یہ روانگی سے قبل ایک نئی اور حوصلہ شکن افتاد تھی مجھے محسوس ہوا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ آخری لمحے میں کیا کروں ـــ؟

اُس نے مجھ سے مزید کہا۔ "آپ میرے ساتھ چلیں اور رقم کا انتظام کریں۔"

قصہ مختصر میں نے ائیرپورٹ پر الوداع کہنے والے ایک دوست سے دو سو روپے لے کر سیکورٹی افسر کے حوالے کیے اور خدا کا شکر بجا لاتے ہوئے بہ عجلت تمام پلین پر سوار ہو گیا۔ مجھے دھڑکا لگا تھا کہ اگر کچھ لمحے مزید ٹھہرا تو کہیں دوسری مصیبت نہ چمٹ جائے۔

ریاض احمد قریشی نے مرکزی وزیر داخلہ، قومی امور کے وزیر ممتاز احمد خاں دولتانہ اور پاکستان کے تمام اخبارات کو اس واقعہ کی رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ "اس واقعہ کو اعلیٰ حکام تک پہنچانے سے قبل میں اس بارے میں کافی غور و فکر کرتا رہا۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ خاموشی اختیار کر کے میں ایک قومی جرم کروں گا۔ مجھے اس افسوسناک صورت حال سے پاکستان کے ذمہ دار افراد کو باخبر کرنا چاہیئے جبکہ پاکستان ہی کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے این۔ او۔ سی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

میں کراچی ایئرپورٹ کے اُن تمام لوگوں کو شناخت کر سکتا ہوں جنہوں نے مجھ سے فراڈ کیا اور این۔ او۔ سی کے نام پر تین سو روپے اینٹھ لیے۔ میں اپنی سوسائٹی کو اس قسم کی بدترین بدعنوانیوں سے پاک کرنے کے لیے اعلیٰ حکام سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اس قسم کی بدعنوانیوں کی روک تھام کے لیے مؤثر اقدام کریں گے اور پاکستان کو تباہی سے بچانے کے لیے ایسے بدعنوان اور راشی افسروں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں فوری ردِ عمل کا اظہار کیا جائے گا۔

بقیہ: اظہار خیال

میں بکھرے ہوتے ہیں۔ اگر کراچی کو اُردو صوبہ بنانا ہے تو تقی صاحب یہ بھی واضح کریں کہ سندھ کے دیگر ضلعوں میں آباد اردو بولنے والوں کے لیے اُن کا کیا حکم ہے۔ کیا انہیں خودکشی کرنی چاہیئے یا ایک دفعہ پھر مہاجر بن کر انہیں تقی صاحب کی اُردو ریاست میں آنا پڑے گا۔ اور کیا اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک نہیں روا رکھا جائے گا جو مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے بہاریوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ جنہیں اورنگی ٹاؤن کے کھلے میدان میں مصائب برداشت کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اگر تقی صاحب کی خواہش پر کراچی کو سندھ سے جدا کر کے غیر سندھی صوبہ بنانا تسلیم کر لیا جائے تو کیا پھر پشتو بولنے والوں کا یہ حق ہے کہ منگھو پیر، پٹھان کالونی اور فرنٹیر کالونی کو پشتو صوبہ بنائیں۔ اگر گجراتی بولنے والوں کے لیے پرانے کراچی یعنی کھارادر، رام سوامی تک گجراتی صوبہ بنایا جائے کیا اس طرح تقی صاحب خود اپنی منطق کا شکار ہو کر کراچی کی ہر گلی اور ہر محلے کو الگ الگ صوبہ بنا کر اسلام، پاکستان مہاجر اور اُردو، غرض سب کا بیڑہ غرق کرنے والے نہ بنیں گے۔

تقی صاحب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ محترم قوموں کے حقوق الفاظ کی بازی گری اور فرضی حکایتوں سے نہیں دبائے جا سکتے۔ سندھی قومیت ایک زندہ حقیقت ہے اور اگر دیو تا بھی نظر انداز کرنا چاہیں تو عوام کی طاقت اپنے حقوق بزورِ بازو حاصل کر لیتی ہے۔ عوام کی طاقت کا اندازہ گھر سے نکل کر کیجئے ورنہ آپ کی خیالی جنت آپ کو بھی اور آپ کے ساتھ بہت سے معصوموں کو بھی تباہ کرے گی۔

بقیہ: اداریہ

کر لیا ہے۔ ان کا دباؤ بڑھ رہا ہے۔ وہ عوام کے دلوں میں وطنِ عزیز کے خلاف نفرت پیدا کر رہے ہیں۔ بھارت کو دعوت دیتے ہیں کہ بچاؤ، روس سے کہتے ہیں، آؤ، آؤ اور بچاؤ کے اس خوفناک منصوبے نے ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے، جہاں دوسری جانب سے محبِ وطن آوازیں دے رہے ہیں۔ آگے بڑھو اور وطن دشمنوں کا خاتمہ کر دو یقیناً فتح وطن دوستوں کو ہوگی۔

مشہورِ عالم



کیپسٹن

اب فلٹر ٹپ کے ساتھ

نئے، لانگ سائز مقبولِ زمانہ کیپسٹن فلٹر سگریٹ ۱۰۲۰ روپئے میں دس } بمعہ سرچارج
۲۰۴۰ روپئے میں بیس }

PTC72—CA1



Weekly "Al - Fatah" Karachi
17 - 24. August, 1972